مرزا محمد ہادی رسوا

امراؤ جان ادا

مقدمہ تمکین کاظمی

ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارت گر ہوش
جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

امراؤ جان ادا

رسوا

مرزا محمد ہادی رسوا (بی۔ اے۔)
ڈاکٹر آف فلاسفی اینڈ ڈی۔ او۔ ایس۔

مُقدمہ

تمکین کاظمی

مکتبہ الفاظ
مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ایڈیشن ---- ۱۹۸۸ء

تعداد ------- ۵۰۰

قیمت -------- ۱۵/۰۰

کتابت : س۔ ریاض، الہ آباد

مطبع : تاج آفسٹ پریس، الہ آباد

EBH

تقسیم کار

ایجوکیشنل بک ہاؤس

مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پیش لفظ

امراؤ جان ادا اردو کا زندۂ جاوید ناول ہے۔ اسے شائع ہوئے کچھ کم سو سال ہو گئے لیکن اس پوری صدی میں کبھی اس کی مقبولیت میں ذرّہ برابر کمی نہیں ہوئی طوائفوں کے بالاخانے جو تفریح گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجلسی آداب سکھانے کے ادارے بھی ہوتے تھے آج بھی ناپید ہیں اور کل تو ان کا ذکر صرف چند کتابوں میں محفوظ رہ جائے گا۔ یہ ناول اس وقت بھی مقبول ہوگا اور آج سے کہیں زیادہ۔

امراؤ جان ادا ایک طوائف کی داستانِ حیات نہ ہے مگر ایک ایسی داستان جس میں ۱۸۵۷ء اور اس کے ذرا پہلے اور ذرا بعد کا لکھنؤ پوری طرح سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

بوڑھی امراؤ جان زندگی کے ہنگاموں سے کنارہ کر چکی ہے۔ جس کمرے میں اب کی رہائش ہے اس کے دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے ہیں۔ چوک کی طرف کا دروازہ مقفل ہے۔ ملازموں کی آمدورفت اس دروازے سے ہے جو گلی کی طرف کھلتا ہے۔ کبھی کبھی گانے کی آواز نہ آتی تو کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے۔ برابر کے کمرے میں جناب رسوا کے ایک دوست آ بستے ہیں۔ مشاعرے کی محفل سجتی ہے۔ کسی شعر پر برابر کے کمرے سے داد دی جاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کھڑکی کے اس پار

بھی شعر و سخن کا کوئی قدر دان موجود ہے۔ یہ قدر دان ہیں امراؤ جان ادا، جو خود بھی شاعرہ ہیں۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے حالانکہ شناسائی پہلے سے تھی۔ رسوا کرید کرید کر ان کے حالات دریافت کرتے ہیں اور ادا کی مرضی کے خلاف اسے ناول کی شکل میں مرتب کر کے شایع کر دیتے ہیں۔

ناول میں رسوا ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ قصے کو قابو میں رکھتے ہیں۔ جہاں مزید معلومات درکار ہے وہاں اصرار کر کے تفصیل دریافت کرتے ہیں اور جہاں تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے وہاں بات کاٹ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کا پلاٹ اتنا مکمل اور گتھا ہوا ہے کہ نہ کہیں کمی کا احساس ہوتا ہے، نہ کوئی بات غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔

امراؤ جان ادا کا قصہ

امراؤ جان ادا کبھی امیرن تھی۔ فیض آباد کے ایک محلے میں اس کا چھوٹا سا کنبہ آباد تھا۔ باپ جمعدار تھا اور صبح کا گیا شام کو لوٹتا تھا۔ ماں گھر کے کام کاج میں دن بھر گھری رہتی تھی۔ امیرن کا مشغلہ تھا اپنے چھوٹے سے بھائی کو گود میں لئے املی کی چھاؤں میں کھیلنا۔ پاس ہی ایک بدمعاش دلاور خاں رہتا تھا جس کی امیرن کے باپ سے دشمنی تھی۔ ایک دن موقع پا کر اس نے بدلہ لیا اور امیرن کو اغوا کر لیا۔ اسے لے کر دلاور خاں لکھنؤ آیا اور ایسی جگہ ٹھہرا جہاں لاوارث بچوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ یہاں امیرن نے ایک کوٹھری میں رات بسر کی۔ اس کوٹھری میں ایک اور ستم زدہ بچی رام دئی بھی تھی۔ ایک بیگم نے اسے اپنے بیمار بیٹے کے لئے خرید لیا۔ امیرن کا سودا ایک نائکہ سے ہوا۔ یہ خانم تھیں۔ انھوں نے امیرن کی پرورش کی ذمہ داری بوا حسینی کو سونپ دی۔ مولوی صاحب نے لکھنا پڑھنا سکھایا، استاد نے موسیقی کا ماہر بنایا۔ آخر کار وہ امیرن سے امراؤ جان بن گئیں۔ شعر کہنے

لگیں تو اداؔ تخلص کیا۔

ہوش سنبھالا تو ایک کے بعد ایک کئی مردوں سے تعلق رہا۔ گوہر مرزا تو ان کی زندگی میں داخل ہونے والا پہلا شخص تھا لیکن یہ معاملہ چپ چپاتے کا تھا۔ چودہ برس کی ہوئیں تو راشد علی نے خانم کو "مستی" کے پانچ ہزار روپے دیئے اور سو روپیہ مہینہ پر امراؤ جان کو ملازم رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد ایک خوب رو نواب زادے سلطان ان کے کوٹھے پر تشریف لائے۔ پہلے ہی دن ان کے ہاتھ سے ایک قتل ہوگیا۔ پھر انھوں نے اس کوٹھے کا رخ نہ کیا لیکن امراؤ جان کا دل ان کی طرف مائل تھا اس لئے ادھر ادھر ملاقات کے موقعے نکالے گئے۔

امراؤ جان خوب رو اور خوش گلو تھیں، اونچے اونچے گھروں میں مجروں کے لئے بلائی جاتی تھیں اس لئے یہ کچھ مشکل بھی نہ تھا۔

اب امراؤ جان کی زندگی میں ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ ان کے کوٹھے پر ایک ایسا شخص آیا جس کی وضع بانکوں کی سی تھی۔ طور طریقوں سے ان گھڑ سا لگتا تھا مگر دل کا ایسا کہ اچھے اچھے رئیس اور شہزادے اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ بے حساب روپے، اشرفیاں اور زیورات لاتا اور جھین سے امراؤ جان کی گود میں ڈال دیتا۔ امراؤ جان اس سے ایسی مانوس ہوئیں کہ یہ کبھی نہ پوچھا کہ تم ہو کون اور اس کے ساتھ رات کی تاریکی میں گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ راستے میں راجا دھیان سنگھ کے سپاہیوں نے آگھیرا تو پتہ چلا کہ یہ توفیق علی ڈاکو تھا۔ وہ بھاگ نکلا۔ یہ گرفتار ہو کے راجا کے سامنے پیش ہوئیں۔ یہاں پتہ چلا کہ ان کی ساتھی طوائف خورشید جو میلے سے غائب ہوگئی تھی اسے راجا نے اٹھوا لیا تھا اور اب وہ یہاں عیش کر رہی تھی۔

یہاں سے امراؤ جان کانپور پہنچیں اور کرائے پر کمرہ لے کر اپنی محفل سجالی۔ یہاں ایک نواب کی بیگم نے امراؤ جان کے گانے کی تعریف سن کے انھیں اپنے گھر بلایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا، کچھ سوچا، بھولی ہوئی باتیں یاد آئیں۔ یہ بیگم صاحبہ رام دئی تھیں

جنھوں نے بچپن میں امیرن کے ساتھ ایک بے کسی کی رات گزاری تھی اور جنھیں ایک بیگم صاحبہ نے اپنے بیمار بیٹے کا دل بہلانے کے لئے خرید لیا تھا پتہ چلا کہ وہ بیٹا ان کا قدردان اور وفا کا پتلا نکلا۔ یہ بیٹا کون تھا؟ یہاں اس بھید کو ظاہر کرنا فن کا قبل از وقت خیال کرتا ہے۔

امراؤ جان کانپور میں زیادہ دن نہ رہی تھیں کہ بوا حسینی اور گوہر مرزا آکے انھیں لکھنؤ لے گئے۔ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ پر قیامت ٹوٹی تو یہ پھر وہاں سے نکلیں اور قسمت انھیں فیض آباد لے آئی۔ فیض آباد جہاں معصوم امیرن کا بچپن بیتا تھا۔ یہاں ایک مجرے کی دعوت ملی۔ یہ پہنچیں تو وہ محلہ ان کا اپنا محلہ تھا۔ جس املی کی چھاؤں میں امیرن کھیلتی کودتی تھی آج قسمت وہاں امراؤ جان کو نچوا رہی تھی۔ ماں نے انھیں پہچانا تو دھاڑیں مار کر روئی۔ چھوٹے بھائی کو پتہ چلا تو غیرت اور غصے قتل پر آمادہ ہو گیا لیکن بڑی بہن سمجھ کے چھوڑ دیا۔

امراؤ جان پھر لکھنؤ لوٹ گئیں۔ وہاں نوچندی کے میلے میں بیگم صاحبہ یعنی رام دئی سے پھر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی کوٹھی پر بلایا اور اب یہ عقدہ کھلا کہ وہ نواب جنھوں نے رام دئی کو گھر میں ڈال لیا تھا نواب سلطان تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر زبانیں بند رہیں کہ اب دونوں زمانے کے سرد و گرم سے خوب واقف ہو چکے تھے۔

ظالم دلاور خاں بھی آخر کار اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء کی لوٹ مار میں شامل تھا۔ لوٹ کا مال اس نے گڑھے میں دبا دیا تھا۔ امراؤ جان اسے گڑھا کھودتے دیکھ لیتی ہیں۔ وہ پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ ناول کے آخر میں امراؤ جان اپنے زندگی بھر کے تجربوں پر گفتگو کرتی ہیں اور اسی پر ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

کیا امراؤ جان کا قصہ سچا ہے؟

اس ناول میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اصلیت سے اتنا قریب ہے کہ پڑھنے والا اس

قصّے کو فرضی اور امراؤ جان کو ناول نگار کا گڑھا ہوا کردار مان ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے شایع ہونے کے بعد امراؤ جان سے ملاقات کے اشتیاق میں لوگ اکبری دروازے کے پاس ان کا پتہ پوچھتے پھرتے تھے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ سفر کے دوران امراؤ جان کو ایک سرائے میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ نزدیک ہی ایک کنواں ہے۔ امراؤ جان اس کا پانی پیتی ہیں۔ ناول شایع ہونے کے بعد یہ سرائے امراؤ جان کی سرائے اور یہ کنواں امراؤ جان کا کنواں کہلانے لگا۔

فن کار نے ناول میں بہت دلچسپ اور پر اثر تکنیک استعمال کی ہے۔ امراؤ جان کی داستانِ حیات خود انھیں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی نے سن سنا کے بیان کر دی ہو۔ لیکن فن کار نے ایک اور کردار وضع کیا ہے۔ یہ ہیں رسوا۔ امراؤ جان اپنی کہانی سناتی جاتی ہیں، رسوا سنتے جاتے ہیں اور آخر کار اس کا مسودہ تیار کر کے نظرِ ثانی کے لئے امراؤ جان کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ گویا رسوا ایک فرضی کردار ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ مرزا محمد ہادی کا تخلص ہو۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس ناول سے پہلے ان کا پورا نام مرزا محمد ہادی ہادیؔ لکھا جاتا رہا۔ مطلب یہ کہ ناول کا کردار رسوا خود مصنف نہیں، ناول میں مصنف کا نمائندہ ضرور ہے۔ لیکن ناول شایع ہوا تو پڑھنے والوں نے دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا اور یوں مرزا محمد ہادی ہادیؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ ہو گئے۔ خود انھوں نے اسے حقیقت مان لیا۔ وجہ یہ کہ مرتے دم تک وہ یہ ثابت کرتے رہے کہ امراؤ جان کوئی من گھڑت کردار نہیں۔ یہ سچ مچ ایک طوائف تھی اور جسے اس نے اپنی داستان سنائی وہ میں ہی تھا۔ جی ہاں رسواؔ میں ہی ہوں۔

ناول میں ایسی شہادتیں موجود ہیں اور میمونہ بیگم نے دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ اداؔ اور رسواؔ دونوں فرضی کردار ہیں۔ بلاشبہ اس نام کی کئی طوائفیں گزری ہیں لیکن مرزا ہادی کے زمانے میں اس نام کی کوئی طوائف لکھنؤ میں نہ تھی۔

ناول میں رسوا اور ادا دونوں کو بے تکلف اور تقریباً ہم عمر دکھایا گیا ہے۔ منشی احمد حسین کے کمرے میں مشاعرے کی محفل جمتی ہے۔ کسی شعر پر برابر کے کمرے سے داد دی جاتی ہے اور آخر مہری آئی ہے کہ رسوا صاحب کو بیوی جی نے بلایا ہے۔ یہ جاتے ہیں اور بے ساختہ منھ سے نکلتا ہے "آہا امراؤ جان تشریف رکھتی ہیں"۔ وہ دیکھتے ہی فرماتی ہیں۔ "اللہ مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں دیرینہ مراسم تھے۔ عمریں بھی کم و بیش برابر ہونی چاہئیں لیکن ناول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کے غدر میں بگڑ رہی تو امراؤ جان جو زندگی کے کافی نشیب و فراز دیکھ چکی تھیں خانم کے ساتھ لکھنؤ سے نکلیں اور یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ مرزا محمد ہادی غدر کے ایک سال بعد ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ اس طرح ادا اور رسوا دونوں کا ذہنی ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس فیصلے کے خلاف دلیلیں نہ دی جا سکیں۔ ناول چھپنے کے بعد کی کہانی بھی ناول ہی کی طرح دلچسپ ہے۔ تسکین کاظمی نے دو باتیں خود مرزا ہادی سے سن کے لکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا ہادی نے امراؤ جان کی آوارگی کا قصہ شائع کر دیا تو ان کے دل میں انتقام کی آگ دہکنے لگی۔ انھوں نے بھی بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ انھیں خبر تھی کہ زمانۂ جوانی میں مرزا بھی کسی بڑی خاتون کے عشق میں مبتلا رہ چکے ہیں اور اسی نے ان کو نیم دیوانگی کی حالت میں پہنچایا ہے۔ مرزا کی عدم موجودگی میں وہ ایک دن مرزا کی کوٹھی پر پہنچیں اور نوکر کو کچھ دے دے کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ گھر کے چپے چپے کی تلاشی لی اور مرزا کی مثنوی "نالۂ رسوا" ڈھونڈ نکالی۔ اس میں مرزا نے اپنی داستان معاشقہ نظم کی ہے۔ امراؤ جان نے کل احوال لکھا اور مع مثنوی "جنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا" کے نام سے اس منھ توڑ جواب کے ساتھ شائع کر دیا کہ

دشنام دے کے مجھ کو بہت خوش نہ ہوجیے
کیا کیجیے گا آپ جو میری زباں کھلی

بے شک یہ مثنوی اور رسالہ موجود ہیں مگر یہ سب خود مرزا ہادی کی کارستانی ہے اور مقصد صرف یہ کہ ہر پڑھنے والے کو یقین ہو جائے کہ امراؤ جان ادا سچ مچ لکھنؤ کی ایک طوائف تھی اور یہ اس کی سچی کہانی ہے۔

اگر امراؤ جان ادا کسی طوائف کی سچی سرگزشت ہے تو ناول نگار کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے ناول میں اس کی زندگی کی کامیاب عکاسی کی ہے اور اگر یہ فرضی داستان ہے تو فن کار کی مہارت کا اور بھی زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے۔ امراؤ جان اگر حقیقتاً لکھنؤ کی کوئی طوائف تھی تو وہ مرگئی اور لوگ اسے بھول گئے لیکن ناول کی امراؤ جان ہمارے ادب میں زندۂ جاوید ہے۔

پلاٹ

موجودہ زمانے میں ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں پلاٹ موجود ہی نہیں یا اگر ہے تو ڈھیلا ڈھالا۔ ہمارے ادب میں فسانۂ آزاد اس کی ایک مثال ہے لیکن گتھا ہوا پلاٹ لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ لہذا مربوط پلاٹ رکھنے والے ناول آج بھی زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ اس ناول کے پلاٹ میں فن کار نے ذرا سا بھی جھول نہیں آنے دیا۔ ناول کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو قصے کو آگے بڑھانے میں مدد نہ کرتا ہو یا جس سے پلاٹ میں ذرا سا بھی جھول آ جاتا ہو۔

امراؤ جان ادا کا پلاٹ مرکب اور پیچیدہ پلاٹ ہے۔ قصہ فیض آباد میں امیرن کے اغوا سے شروع ہوتا ہے۔ جب لکھنؤ میں رام دئی کا ایک بیگم صاحبہ اور امیرن کا خانم سے سودا ہو جاتا ہے تو یہاں سے قصہ پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ رام دئی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں مگر دماغ سے محو نہیں ہوتیں۔ پڑھنے والے کو یہ فکر ستاتی رہتی ہے کہ ان پر کیا بیتی۔ ادھر امیرن امراؤ جان بن کے جس دنیا میں قدم رکھتی ہیں اس میں خانم اور بوا حسینی ہیں، بسم اللہ، خورشید جان ہیں، گوہر مرزا، نواب سلطان، راشد علی، فیض علی ہیں۔ ان سب کے اپنے اپنے قصے ہیں اور یہ نہ ہوتے تو امراؤ جان ادا مکمل ناول نہ بن پاتا۔

امراؤ جان کی رام دئی سے جو اب کانپور والی بیگم صاحبہ ہیں ملاقات ہوتی ہے۔ قسمت انھیں فیض آباد میں اپنے گھر لے جاتی ہے۔ یہاں ان کی ملاقات اپنی ماں اور بھائی سے ہوتی ہے جو انھیں اپنانے کو تیار نہیں۔ یہاں دائرہ مکمل ہو جاتا ہے اور جب دلاور خاں گرفتار ہو کر کیفر کردار کو پہنچتا ہے تو ناول گویا اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے۔

امراؤ جان ادا کے پلاٹ کی تعمیر میں عمارت کا سا وصف ہے کہ ایک پر ایک اینٹ رکھی جاتی ہے اور دھیرے دھیرے عمارت اوپر اٹھتی ہے۔ ہر واقعہ ایسا ہے کہ اسے درمیان سے ہٹا لو تو عمارت ڈھے جائے گی۔ مختصر یہ کہ ناول نگار نے پلاٹ کی تعمیر میں زبردست فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

کردار نگاری

کردار نگاری میں مرزا ہادی کے قلم نے جادوگری کا کمال دکھایا ہے۔ امراؤ جان ادا کے کردار مشاقی اور فن کاری کا معجزہ ہیں۔ امراؤ جان کے علاوہ ناول میں بہت سے کردار ہیں۔ کچھ دور تک پھیلے ہوئے، کچھ پل بھر کو نظر آ کے آنکھ سے اوجھل ہو جانے والے مگر دونوں لازوال اور حافظے سے کبھی نہ مٹنے والے فیض علی ڈاکو کے ساتھی فضل علی جو نواب سلطان کے گھر ڈاکہ ڈالنے آتے ہیں لیکن اپنے دوست کی آشنا کو یہاں پاکے لوٹ مار کا ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔ وہ ذرا دیر کو نمودار ہوتے ہیں مگر دائمی نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ "ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں" کا مختصر جملہ ادا کر کے سائیس بھی اپنی انفرادیت کا سکہ جما دیتا ہے۔ نواب سلطان کا جاں نثار ملازم ایک پل کو نظر آتا ہے مگر ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

یہ مرزا کی فن کاری کا کمال ہے کہ ہر کردار اپنی جماعت کا نمائندہ ہونے کے باوجود انفرادیت کا مالک ہے۔ امراؤ جان، خورشید، بسم اللہ سب طوائفیں ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل الگ۔

امیرن جب پہلی بار خریداری کے لئے خانم کے سامنے پیش ہوئی تو وہ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔ کنول روشن ہے، بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی ناچ رہی ہے۔ یہ سانولی سی لڑکی خانم کی بیٹی بسم اللہ تھی۔ طوائف اور طوائف زادی۔

یہ بڑی ہو کے آفت کی پرکالہ نکلی۔ بہت مکار، لالچی اور زبان دراز، ضد کی پکی تھی اور کسی کی پرواہ نہ کرتی تھی۔ حد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ سے ماں کو بھی بہت تکلیفیں پہنچیں اور بیٹی کی صورت سے بیزار ہو گئیں۔

خورشید جان اچھی صورت کی تھی۔ آواز تو اچھی نہ تھی مگر ناچتی خوب تھی۔ مزاج کی نیک دل کی اچھی مگر تقدیر کی ہیٹی تھیں۔ حُسن خدا داد تھا، چہرے سے شرافت برستی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کے لائق نہ تھیں۔ وہ جسے چاہتی تھیں ٹوٹ کے چاہتی تھیں۔ کسی کی بیوی ہوتیں تو وفادار رہتیں اور خوب نباہ کرتیں۔ دس کا ہو کے جینا انھیں پسند نہ تھا، کسی ایک کی ہو کے رہنا چاہتی تھیں۔ پیارے صاحب کو ان سے عشق تھا۔ ان کی جائیداد ضبط ہو گئی اور وہ محتاج ہو گئے تو ان کا اصرار تھا کہ مجھے گھر میں ڈال لو۔ پیارے صاحب کی شادی کہیں اور ہونے لگی۔ وہ مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے، پہلے تو چپ بیٹھی رہیں، پھر گال سرخ ہو گئے، انھیں اور مانجھے کے جوڑے کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر جو رونا شروع کیا ہے تو دو دن روتی رہیں۔ بخار آنے لگا۔ ایک دن راجا دھیان سنگھ نے میلے میں سے انھیں اٹھوا لیا۔ یہ اس کے گھر خوش تھیں کہ اب کسی ایک کا تو ہو کے رہنا ہے۔

فیض علی کا کردار بھی بہت جاندار ہے۔ وہ ڈاکو ہے، خوب لوٹتا ہے، خوب لٹاتا ہے، دلیر ہے، بات کا پکّا ہے۔ نواب سلطان کا کردار بھی ناول نگار کا شاندار کارنامہ ہے۔ ناول میں مولویوں کے کئی کردار ہیں اور سب ایک دوسرے سے الگ۔ سب سے دلچسپ کردار ان مولوی صاحب کا ہے جو بسم اللہ پر عاشق ہیں اور اس کی بندریا کو ڈانٹ کے اگلے دن سزا پاتے ہیں۔ مقدس صورت، نورانی چہرہ، عربی کے عالم، سفید داڑھی، ستر برس کی عمر، ایک ہاتھ میں عصائے مبارک دوسرے میں زیتون کی تسبیح، ہونٹوں پر یا حفیظ کا ورد مگر ایک رنڈی بسم اللہ پر عاشق ہیں۔ اس نے حکم دیا نیم پر چڑھ جاؤ۔ ان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، تھر تھر کانپنے لگے۔ کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ اتنے میں پھر نادر شاہی حکم پہنچا "کہتی ہوں چڑھ جاؤ"۔ انھوں نے عبائے شریف اتاری، پائنچے چڑھائے اور نیم کی پھننگ تک پہنچ گئے۔ مصنف نے مولویوں کے کرداروں سے طنز و ظرافت کا کام بھی لیا ہے۔ ناول کا سب سے زبردست اور شروع سے آخر تک چھایا ہوا کردار امراؤ جان کا ہے۔ کردار نگاری کے معاملے

میں اس ناول کا جواب مشکل ہی سے پیدا ہوگا۔

دیگر خصوصیات

مکالمہ نگاری بھی ناول کے فن کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے۔ مصنف نے یہاں بھی فنکاری کا زبردست مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کرائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں اور ہم قدم قدم پر اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ بے شک اس موقع پر اس کردار کے منھ سے بس یہی بات اور انھی الفاظ میں ادا ہوسکتی تھی۔ ناول کے مکالمے کرداروں کے باطن کو بے نقاب کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ظرافت کی چاشنی بھی ناول میں جا بجا موجود ہے۔ امراؤ جان سے رسوا کی نوک جھونک بعض جگہ بہت پر لطف ہوجاتی ہے۔ بعض کردار تو ایسے ہیں ان کی صورت دیکھ کر ہی ہنسی آجاتی ہے۔ ظرافت نے اس ناول کو اور بھی پر لطف بنا دیا ہے۔

مرزا محمد ہادی (بلکہ ان کا نام اب مرزا رسوا ہی لینا چاہئے) ایک مصلح تھے۔ دوسرے ناولوں میں ان کا اصلاحی جذبہ بہت نمایاں ہے۔ اس ناول میں بھی خانم اور امراؤ جان کی زبان سے گئی جگہ ایسی باتیں کہلوائی گئی ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے لیکن عام طور پر مصلح رسوا پر فن کار رسوا غالب نظر آتے ہیں۔ ان کا مقصد ہے ایک عہد اور ایک معاشرت کی مکمل عکاسی۔ یہ عہد ۱۸۵۷ء کے قریب کا عہد ہے اور یہ معاشرت لکھنؤ کی زوال آمادہ معاشرت ہے۔ اس معاشرت کے تمام پہلو بے نقاب کرنے اور اس کے جملہ اشخاص و افراد کو پیش کرنے کے لئے طوائف کے کوٹھے سے بہتر کوئی اسٹیج نہ ہوسکتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر قسم کے لوگ خواہ وہ امیر ہوں یا گردشِ دوراں کے ہاتھوں محتاج ہوگئے ہوں، عالم ہوں یا جاہل، مولوی ہوں یا اوباش سب ایک ایک کر کے آتے ہیں اور اپنا اپنا رول ادا کر کے تاریخ میں امر ہوجاتے ہیں۔

امراؤ جان ادا ہماری زبان کا ایک ناقابلِ فراموش ناول ہے۔

—— نور الحسن نقوی

مقدمہ

میرے بچپن میں اردو ادب نہایت ہی مختصر تھا۔ داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا اور چند پرانے قصوں کے علاوہ صرف چند ناولیں تھیں جو پڑھی جا سکتی تھیں۔ میری اردو جب نکلنے لگی تو میں نے انھیں قصوں کو پڑھنا شروع کیا۔ پھر افسانے یعنی داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا اور اس کے بعد ناولیں پڑھنی شروع کیں۔ ان دنوں چند ہی ناولیں تھیں۔ لکشمن دت عابر اور کوئی گوہر نامی ناول نویس تھے۔ ان دونوں نے رطب و یابس بہت بھر دیا تھا، مگر معیاری لکھنے والے چند ہی تھے۔ محمد علی طبیب کی ناولیں زیادہ اچھی تھیں۔ ان کے بعد شرر کا نمبر تھا۔ اسی زمانے میں مرزا رسوا کی ناول امراؤ جان ادا بھی نکلی جسے میں نے پڑھ ڈالا، پھر پڑھا اور پھر پڑھا۔ نہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ میں نے امراؤ جان ادا کو کئی کئی بار پڑھا اور اسے بہت زیادہ پسند کیا۔ مرزا رسوا کے متعلق کوئی معلومات نہ تھیں البتہ شرر سے میں ذاتی طور پر واقف تھا کیوں کہ وہ والد مرحوم کے دوست تھے اور میں ان سے ملتا رہتا تھا۔ شرر کے تعلقات حیدر آباد سے تھے اور وہ حیدر آباد آتے رہتے تھے مگر مجھے مرزا رسوا سے ملنے اور ان سے یہ پوچھنے کا شوق تھا کہ واقعی امراؤ جان کوئی عورت تھی یا فرضی کردار تھا۔ یہ آرزو پوری نہ ہوتی تھی کیوں کہ مرزا رسوا نہ تو حیدر آباد آتے تھے اور نہ میں لکھنؤ جاتا تھا۔ اس طرح ایک خلش میرے دل میں برابر چلی آ رہی تھی۔

مولوی فدا حسین میرے ایک عنایت فرما تھے جو توپ بازار میں مرلی دھر کے باغ میں

رہتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ فدا حسین صاحب شاعر اور بڑے علم دوست تھے اس لئے ان کے پاس علمی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث پر بحث ہونے لگی اور دو پارٹیاں الگ الگ بن گئیں۔ جب کسی طرح تصفیہ نہ ہوا تو فدا حسین صاحب نے کہا کہ بھئی چلو بازو ہی میں مرزا ہادی ہیں، ان سے پوچھ لیں گے۔ میں نے دریافت کیا "یہ مرزا ہادی کون ہیں" تو فدا حسین صاحب نے کہا "لکھنؤ کے فاضل اور اہل زبان ہیں، دارالترجمۂ عثمانیہ میں مترجم ہو کر آئے ہیں، بڑی اچھی معلومات ہیں"۔ چنانچہ ہم لوگ مرزا ہادی کے پاس پہنچے۔ ایک مجتہد قسم کے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے جو بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ فدا حسین صاحب نے میرا تعارف کرایا اور مزاج پرسی کے بعد وہ الفاظ جن کی تذکیر و تانیث کی بحث ہو رہی تھی سنائے گئے۔ مرزا ہادی نے لکھنؤ کی حد تک ان الفاظ کا استعمال بتایا، حوالے بھی دئے، چند شعر بھی سنائے، انھیں میں ایک لفظ "اشتعالک" بمعنی اشتعال دلانا تھا جو دکن میں عام طور پر مستعمل تھا۔ میں نے اس کے متعلق کہا تھا کہ "یہ پرانا لفظ ہے، دلی لکھنؤ والے پہلے انھیں معنوں میں استعمال کرتے تھے اب اسے چھوڑا ہے اور دہلی سے یہ لفظ دکن پہنچا ہے اور اب تک انھیں معنوں میں مستعمل ہے"۔ جب فدا حسین صاحب نے یہ سنایا تو مرزا صاحب نے پوچھا کہ "کس نے کہا کہ یہ لفظ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا"۔ فدا حسین صاحب نے میری طرف اشارہ کیا تو مجھ کو پوچھا "آپ کا وطن"؟ میں نے عرض کیا "دکن!"۔ فرمانے لگے "پھر یہ لکھنؤ اور دہلی کے استعمال سے متعلق آپ کو معلومات کیسے ہوئیں؟"۔ میں نے عرض کیا "قبلہ! مجھے مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ جنون ہے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کرتا ہوں، علاوہ ازیں میرے ملنے والے لکھنؤ اور دہلی دونوں مقامات کے ہیں۔ ان کی متروکات اور تذکیر و تانیث ذہن میں رکھا کرتا ہوں، اس لئے میں نے عرض کرنے کی جسارت کی ہے"۔ فرمانے لگے "میاں! تم صحیح کہتے ہو۔ لکھنؤ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے، میں نے بھی امراؤ جان میں اس کا استعمال کیا ہے"۔ اس جملے پر مجھے حیرت ہونے لگی کہ ان کو امراؤ جان سے کیا تعلق؟ رفع استعجاب کے لئے میں نے دریافت کیا کہ "کیا امراؤ جان کی کتابت آپ نے کی ہے؟" تو فرمایا "نہیں میں نے

لکھی ہے!" میں نے دریافت کیا "لکھنے کے معنی صاف نویسی یا کاپی نویسی ہیں؟" تو فرمایا "نہیں صاحب! تصنیف کی ہے میں نے!" میں نے کہا "حضرت وہ تو مرزا رسوا کی کتاب ہے"۔ کہنے لگے "بھائی! میں نے اپنا ایک قلمی نام رسوا رکھا ہے۔ اسی نام سے امراؤ جان ادا چھپوائی ہے"۔ اس ناگہانی ملاقات پر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور میں نے اٹھ کر مرزا رسوا کا ہاتھ چوم لیا اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا کہ مجھے ان سے کتنی عقیدت تھی تو بہت مسرور ہوئے۔ اس روز سے میری دوستی مرزا رسوا سے ہو گئی اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۸ء کا ہے، تقریباً دس بارہ سال مرزا حیدر آباد میں رہے اور میں اکثر ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔

بظاہر مرزا رسوا مذہبی آدمی اور مجتہد قسم کے بزرگ معلوم ہوتے تھے مگر حقیقتاً وہ بہت آزاد مشرب، غیر متعصب، فراخ دل آدمی تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ "آپ کا مذہب کیا ہے؟" جب میں نے عرض کیا کہ "قبلہ! باپ دادا حنفی مسلک کے پیرو تھے، میں بھی اسی پر عامل ہوں اور مجھے بیعت چشتیہ قادریہ۔ دونوں گھرانوں میں ہے" تو بہت خوش ہوئے۔ وہ تقیہ کے قائل نہ تھے اور نہ اپنے عقائد توڑ مروڑ کر بیان کرتے تھے۔ کھلم کھلا جو بات سمجھتے بڑی صفائی سے کہہ دیا کرتے تھے۔ مسئلہ خلافت اور امامت پر میں نے بارہا ان سے گفتگو کی ہے۔ بڑی سلجھی ہوئی اور معقول گفتگو کرتے تھے۔

ہمیشہ علمی ادبی گفتگو فرماتے۔ اپنی زندگی کے حالات بھی سنایا کرتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار کا اسم گرامی آغا محمد تقی تھا جو کہ لکھنؤ کے شرفاء سے تھے۔ مرزا لکھنؤ ہی میں ۱۸۵۷ء میں غدر کے دنوں میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد ماجد سے عربی فارسی پڑھی اور اسکول میں شریک ہو گئے۔ وسطانی تعلیم ختم کر کے لامارٹنز کالج میں شریک ہو گئے۔ پھر رڑکی کے انجینئرنگ کالج میں بھی شرکت کی مگر چند روز کے بعد اسے بھی ترک کر دیا اور ملازم ہو کر کابل چلے گئے۔ کابل میں بھلا ایک لکھنوی نفیس المزاج کا دل کیا لگتا؟ دو سال بڑے برے گذرے، آخر رک نہ سکے، واپس آگئے اور کرسچین کالج میں لکچرر ہو گئے۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنا بھی شروع کیا

اور ۱۹۲۰ء میں چالیس سال کی عمر میں بی۔ اے۔ پاس کیا، واشنگٹن یونی ورسٹی کو اپنا ایک مقالہ بھیج کر پی ایچ۔ ڈی کی اعزازی ڈگری لی۔ مرزا رسوا ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ میں نے مقالہ بھیج کر پی ایچ ڈی لی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ انھیں امراؤ جان ادا پر یہ ڈگری ملی ہے۔ کئی دفعہ میں نے پوچھا بھی کہ "آپ نے امراؤ جان ادا تو ڈگری کے لئے نہیں پیش کی تھی؟" تو گول مول جواب دے کر ٹال دیا۔

بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ فرماتے تھے: دس گیارہ سال کی عمر سے میں شاعری کرتا ہوں اور میں نے مرزا محمد جعفر اوج خلف مرزا دبیر کی شاگردی کی ہے۔ مرزا تخلص کرتے اور شعر اچھے کہتے تھے۔ مرزا صاحب اپنی مفلسی اور مفلوک الحالی کے قصے بھی نہایت صفائی سے سنا دیا کرتے تھے۔ طبیعت میں ایک قسم کی سنک تھی، بیٹھے بیٹھے کھو جاتے، باتیں کرتے کرتے بہک جاتے، لکھنؤ کی کسی صحبت کا ذکر کرتے کرتے کابل کا قصہ اور وہاں سے وحشت زدہ ہو کر بھاگنے کی داستان سنانے لگتے۔

مرزا صاحب نے متعدد ناولیں لکھیں، کئی ڈرامے لکھے، فلکیات، ریاضیات اور فلسفہ پر تراجم اور تالیفات کیں۔ کئی مثنویاں بھی لکھیں، آخر عمر میں مذہبی تصانیف شروع کی تھیں اور مذہب کی طرف توغل بڑھتا جا رہا تھا کہ ۱۹۳۲ء میں انتقال کیا۔ مرزا رسوا کا کتب خانہ گو مختصر سا تھا مگر بڑا ہی نفیس تھا۔ ان کے ایک فرزند بھی تھے جنھوں نے کتب خانے کا ناس مارا۔

چونکہ میں امراؤ جان ادا کے مطالعہ سے مرزا سے روشناس ہوا تھا اس لئے مرزا سے اس کے بارے میں اکثر پوچھا کرتا تھا اور مرزا کہا کرتے تھے کہ ادا واقعی ایک عورت تھی اور یہ قصہ سچا ہے، البتہ بعض باتیں مرزا نے زیب داستان کے لئے بڑھا بھی دی ہیں۔ مرزا نے امراؤ جان ادا کے شروع حصے میں جن صاحب کا ذکر منشی احمد حسین کے نام سے کیا ہے ان کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے بلکہ دو ایک دفعہ یہ بھی کہا تھا کہ ان منشی احمد حسین کے مہمان وہ دہلی میں بھی ہوئے۔ اس طرح فسانے کی صداقت کا اطمینان مرزا رسوا نے دلا دیا تھا۔

میرے ایک دوست ہیں تراب علی خاں باز جنھیں ابتدا پرانی کتابوں کے جمع کرنے،

پھر ان کے بیوپار کرنے کا شوق ہوا اور انھوں نے ہزاروں کتابیں جمع کیں۔ اپنی مہربانی سے وہ اکثر نایاب کتابیں مجھے دکھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک مختصر سا رسالہ "جنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا" دکھایا جو بڑی دلچسپ چیز تھی۔ اس سے مرزا رسوا کے حالات معلوم ہوتے تھے اور ان کی حیات معاشقہ پر نظر پڑتی تھی۔ میں نے باز صاحب سے وہ مثنوی حاصل کر لی اور اس کو امراؤ جان ادا کے ساتھ رکھا۔ مرزا کی زندگی میں یہ رسالہ مجھے ملتا تو ان سے اس کے متعلق خاص معلومات حاصل ہوتیں مگر اب کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ راز کیا ہے۔

جیسا کہ آپ کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے مرزا رسوا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ "ان کے ایک دوست منشی احمد حسین اطراف دہلی کے رہنے والے سیر کناں لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور چوک میں سید حسین کی پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لیا تھا جہاں اکثر لوگ سر شام بیٹھا کرتے تھے۔ اسی کمرے کے برابر اور ایک کمرہ تھا جس میں ایک طوائف رہتی تھی مگر اس کا طریق بود و باش رنڈیوں سے بالکل مختلف تھا۔ احمد حسین کے کمرے میں شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا چنانچہ ایک روز مرزا نے ایک شعر سنایا تو برابر کے کمرے سے داد ملی اور ادھر سے فقرہ کسا گیا۔ اس کے جواب میں ایک مہری نے آ کر کہا کہ بیوی نے بلایا ہے چنانچہ مرزا وہاں گئے تو دیکھا کہ امراؤ جان تشریف رکھتی ہیں۔ مرزا نے امراؤ جان کو مجبور کر کے احمد حسین کے کمرے میں بلایا اور وہاں لطف صحبت اٹھنے لگا۔ اس تفصیل کے بعد مرزا نے لکھا ہے کہ "میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان سے نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ ان ہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی، اس سرگذشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے مجھے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔"

مرزا کے مجبور کرنے پر امراؤ جان اپنی سرگذشت بیان کرنے لگیں وہ روز تھوڑا تھوڑا قصہ بیان کرتیں اور مرزا اسے لکھ لیا کرتے۔ چنانچہ جب قصہ تمام ہوا تو مرزا نے مسودہ امراؤ جان کے ملاحظہ میں پیش کیا اور انھیں مجبور کر کے اس پر ایک خاتمہ لکھوایا۔ یہ خاتمہ دراصل اس سوانح عمری کا مقدمہ ہے جو بڑا ہی دلچسپ اور کارآمد ہے، اس طرح امراؤ جان کی تکمیل ہوئی ہے۔

مرزا صاحب نے امراؤ جان کے حالات قلم بند کر لئے، پھر امراؤ جان کو بتایا اور اس پر امراؤ جان سے خاتمہ یا مقدمہ جو بھی کہئے لکھوایا اور اسے شایع کر دیا۔ امراؤ جان نے مرزا صاحب کی اس حرکت کو ٹھنڈے دل سے اس وقت تو برداشت کر لیا مگر آخر وہ بھی عورت تھیں، انتقام کی آگ میں جلتی رہیں اور انتقام لے کر چھوڑا۔ یہ انتقام اس رسالہ "جنون انتظار" کے ذریعہ لیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ بڑا لطیف انتقام لیا گیا، اینٹ کا جواب پتھر سے ضرور دیا گیا مگر اس پتھر نے سر کو لہولہان نہیں کیا بلکہ مرزا کے شیش محل کو چکنا چور کر دیا اور ان کے قلب و دماغ کو مجروح۔

"جنون انتظار یعنی فسانہ مرزا رسوا" درما برادرس کے ذریعہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ کے پریس میں پونیا سائز کے ۲۴ صفحات پر چھپا ہے۔ دیباچہ یا تعارف بڑا مزے دار ہے، یہ لیجئے آپ خود ملاحظہ فرمائیے :-

"ناظرین! مرزا رسوا صاحب نے جو میری سرگذشت تحریر کی ہے وہ غالباً آپ کی نظر سے گزری ہو گی، خیر یہ میں اب نہیں کہہ سکتی کہ اچھا کیا یا برا مگر پہلے سے اس کا اقرار نہ تھا اس لیے کسی قدر ملال ہوا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میری آوارگی کا افسانہ چھاپ کر شایع کیا جائے گا تو شاید میں اس کے بیان کرنے پر راضی نہ ہوتی۔ واقعی مرزا صاحب کا چکمہ چل گیا۔ لطف یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے تجھ پر احسان کیا۔ اگر درحقیقت یہ احسان ہے تو میں بھی ان کے ساتھ اس کا عوض کرتی ہوں:

دشنام دے کے مجھ کو بہت خوش نہ ہوجئے!
کیا کیجئے گا آپ جو میری زباں کھلی؟

مرزا رسوا صاحب کے حالات دریافت کرنا سہل نہ تھا۔ یہ وہ شخص ہیں جو اپنا نام تک لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ سے گلدستوں میں غزلیں بھی شایع ہونے لگی ہیں۔ رہتے ایسی جگہ ہیں جہاں کسی کی مشکل سے رسائی ہو سکتی ہے۔ میں صرف ایک مرتبہ آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہو کر اس کی زیارت سے مشرف ہو چکی ہوں، مگر اس وقت کہ جب مجھے معلوم تھا کہ آپ گھر پر نہیں تشریف رکھتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب سے آپ نے میری سوانح عمری شایع کرنے

کا قصد کیا مجھے بھی یہی کد ہوگئی تھی کہ آپ کے بعض اسرار سے دنیا کو واقف کروں۔ اس کے لئے مجھے خاص اہتمام کرنا پڑا، آپ کا ملازم خاص جس کے نام ونشان سے مطلع نہیں کر سکتی مجھ سے واقف ہو گیا۔ ایک دن آپ ایک دوست کے گھر پر مشاعرے میں تشریف رکھتے تھے، بندی نے فوراً گاڑی کی اور آپ کی کوٹھی پر پہنچی۔ آپ کا آدمی جو مجھ سے مل گیا تھا اس نے چپہ چپہ مجھے دکھایا۔ اسی آدمی کے ذریعے سے آپ کی ایک کتاب، جس میں ایک تصویر اور بہت سے خطوط اور ایک ناتمام مثنوی "نالہ رسوا" تھی میرے ہاتھ آگئی۔ کچھ حالات بعض دوستوں سے معلوم ہوئے۔ غرض کہ واقعات کو میں نے بطور خود لکھ کر چھپوا لیا ہے۔ جس دن مرزا صاحب نے میری سوانح عمری شایع کی اور ایک جلد میرے ملاحظہ کے لئے بھیجی اس دن میں نے اس مختصر تحریر کی ایک جلد ان کی خدمت میں روانہ کی۔ یقیناً مرزا صاحب خوش تو نہ ہوئے ہوں گے مگر کیا کر سکتے ہیں"۔

یکم اپریل ۱۸۹۹ء فدویہ

امراؤ جان ادا

مرزا کی ناول امراؤ جان ادا کا سنہ تصنیف ہمیں کہیں مل سکا اور نہ سنہ اشاعت ہی، البتہ اس رسالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے ناول کو ۱۸۹۹ء میں چھپوایا ہے۔ اوپر جو دیباچہ یا تمہید نقل ہوئی ہے اس کے بعد "فسانۂ رسوا" کو امراؤ جان نے اس طرح شروع کیا ہے:

"خوب صورت ہو نیک سیرت ہو!
اور کیا چاہئے بشر کے لئے؟

مرزا رسوا کی وجاہت اور طلاقت لسانی میں غضب کی دل آویزی ہے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں عورت مرد سب انھیں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، جب یہ باتیں کرتے ہیں تو لوگ ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرتے ہیں۔ کوئی شخص کیسا ہی غمگین ہو ان کے پاس دو گھڑی بیٹھے تو غم غلط ہو جائے۔ روتے آدمی کو ہنسا دینا ان کی ادنیٰ سی بات ہے۔ خدا کی دی ہوئی ذہانت پر طرہ علمیت اور تجربہ کاری، ان اوصاف نے ان کے جوہر ذاتی کو اور جلا دے دی ہے۔ طبیعت کی موزونی،

شوق شعر و سخن کو حسن پرستی نے چمکا دیا ہے۔ ان سب اوصاف کے ساتھ مزاج میں کسی قدر سنک ہے۔ بعض طبیبوں کی یہ رائے ہے کہ شمنوں کو جنون کے دورے کا خلل ہے۔ کسی کو یہ خیال ہے کہ آپ کو پریوں کی تسخیر کا شوق ہے، غرض کہ کچھ نہ کچھ اسرار ضرور ہے۔

مرزا صاحب کے ایک دلی دوست نے فرض کر لیجئے کہ میں نے آپ کے اوصاف مثنوی نالۂ رسوا کے وزن پر موزوں کئے ہیں، وہ یہاں حوالہ قلم کئے جاتے ہیں۔

اک مرے یار مہرباں رسوا وحشی آوارہ خانماں رسوا
مست و آشفتہ حال و آوارہ بے دل و بے قرار و بے چارہ
ہرزہ گرد طریق گم نامی رہرو شاہ راہ ناکامی
دل پریشاں و مضطر و بیتاب زار و بیمار و بے خور و بے خواب
کشتہ تیغ الفت جلاد بسمل تیر حسرت بے داد
سر شوریدہ وقف پامالی مغز آشفتہ ہوش سے خالی
مو بمو حسرت و پریشانی سربسر بے دلی و حیرانی
چشم بے خواب خواب سے محروم دل بے تاب تاب سے محروم
اشک پر شور غیرت طوفاں چشمۂ خوں ہر اک بن مژگاں
قطرہ اشک ارغوانی رنگ چہرۂ زرد زعفرانی رنگ
خشک ہونٹوں پہ آہ شعلہ فشاں اک پری وش کا نام ورد زباں
مختصر یہ کہ دل پھنسا ہے کہیں دل بیگانہ آشنا ہے کہیں
کسی کافر کو پیار کرتے ہیں دین و ایماں نثار کرتے ہیں

دوست ہیں میرے کیا کہوں ان کو
سچ تو یہ ہے کہ ہے جنون ان کو"

اس کے بعد ۴۲ شعر نصیحت میں کہے ہیں جن کو مرزا صاحب کی رسوائی سے کوئی تعلق

نہیں ہے۔ اس کے بعد مرزا صاحب کے گھر کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ خاکہ نثری ہے ملاحظہ ہو:

مجھ سے دیوانے کا کیا آپ پتہ پوچھتے ہیں؛
وحشت آباد میں ہے خاص سکونت میری!

"یہ شعر گویا میں نے مرزا صاحب کی زبانی کہا ہے، واقعی آپ جہاں رہتے ہیں اس کو وحشت آباد کہنا چاہئے۔ لکھنؤ سے دو کوس کے فاصلے پر سڑک کے قریب جو لوہے کے پل سے نواب گنج کو جاتی ہے ایک باغ کی مختصر چار دیواری نظر آتی ہے، چاروں طرف کوسوں تک میدان ہے، کہیں آبادی کا نام و نشان نہیں۔ پہلے اس سڑک پر مسافروں کی آمد و رفت تھی مگر جب سے اس طرف ریل نکلی بہت کم لوگ آتے جاتے ہیں۔ اس عالم ہو میں مرزا صاحب کی سکونت ہے، یہاں آپ مع دو تین ملازموں کے رہتے ہیں۔ اس باغ کے وسط میں ایک چھوٹی سی کوٹھی بہت خوش نما بنی ہوئی ہے۔ کوٹھی کے سامنے تھوڑی دور پر ایک پختہ گول چبوترہ ہے، اس کے گرد چمن بندی ہے، یہ صبح اور سر شام بیٹھنے کی جگہ ہے۔ باغ کے اُتّر کی طرف کے گوشے میں ایک جالی دار چوبی احاطہ ہے، اس میں پتھروں کی پہاڑیاں بنی ہوئی ہیں، اس پر عجیب و غریب اقسام کے درخت اس قرینے سے لگائے گئے ہیں کہ وہ گویا ان پتھروں سے اُگے ہوئے ہیں۔ اس کے وسط میں ایک سنگ مرمر کا حوض پانی سے بھرا ہوا ہے، چاروں طرف نالیاں بہتی ہیں، یہ احاطہ سرکیوں سے چھپا ہوا ہے، گرمیوں میں یہاں بڑی خنکی ہوتی ہے کیوں کہ سقے متواتر پانی چھڑکا کرتے ہیں۔ مرزا صاحب دو پہر کو یہیں تشریف رکھتے ہیں۔ فکر اشعار کے لیے یہ مقام بہت مناسب ہے۔ کوٹھی اندر سے خوب سجی ہوئی ہے۔ اس کے ایک کمرے میں مرزا صاحب خود آرام کرتے ہیں، باقی اور کمرے مقفل رہتے ہیں۔ مثنوی نالہ رسوا میں اس کوٹھی کے حالات خود مرزا صاحب اس طرح نظم فرماتے ہیں":

یہی کوٹھی ہے جس میں رہتا ہوں — صدمہ انتظار سہتا ہوں
ایک صاحب تھے پہلے اس میں مقیم — صاحب علم اور عقیل و فہیم
شوق تھا ان کو علم و حکمت سے — ذوق تھا نکتہ ہائے فطرت سے

ایک لڑکی تھی ان کی حور لقا　　حسن میں مہر و ماہ سے بھی سوا

کیا کہوں تجھ سے کیسی صورت تھی　　لے یہ تصویر ایسی صورت تھی!

دیکھ تو کس بلا کی صورت ہے!　　یہی میری قضا کی صورت ہے!

یہی قاتل ہے جان بسمل کی　　یہی جلاد ہے مرے دل کی

ایسی کافر نظر نہ دیکھی تھی　　ایسی بیداد گر نہ دیکھی تھی

اسی کافر ادا پہ مرتا ہوں!　　دیکھ اس دل ربا پہ مرتا ہوں!

تو نہ کہہ میرا دل تو قائل ہے　　یہ خدا چاہنے کے قابل ہے

دیکھ اس چشم نیم باز کو دیکھ　　اس نگاہ کرشمہ ساز کو دیکھ

انھیں آنکھوں کی ہے یہ بیماری　　انھیں زلفوں کی ہے گرفتاری

دیکھ ابرو میں کیا کھنچاوٹ ہے　　دیکھ نظروں میں کیا لگاوٹ ہے

ہے کھنچاوٹ کس امتیاز کے ساتھ　　ہے لگاوٹ نگہ ہے ناز کے ساتھ

دیکھ یہ شوخیاں تبسم کی!　　سوچ پھر خوبیاں تکلم کی!

لطف تقریر کیا بیان کروں　　کیوں کر اس کی ادا بیان کروں

جس کی تصویر کھینچنی ہو محال　　کس طرح پہنچے اس کو وہم و خیال

کیا بیاں ہو نزاکت تقریر
جس سے عاجز ہے صنعت تصویر

کیسی سرخ و سفید رنگت تھی؟　　گورے پن پر ادا قیامت تھی!

گورے دیکھے جو آج تک دلبر　　ان میں ہوتے ہیں بے نمک اکثر

ان میں شوخی ذرا نہیں ہوتی　　اس بلا کی ادا نہیں ہوتی

ان کے دادا کا تھا فرانس وطن　　اور نانا تھے ساکن لندن

ہوئے ماں باپ ہند میں پیدا　　دل سے اس سرزمیں پہ تھے شیدا

لکھنؤ میں یہ خود ہوئیں پیدا
تھا یہی شہر جائے نشو و نما

ان کی دایہ بھی لکھنؤ کی تھی
ان کی آیا بھی لکھنؤ کی تھی

بولتی تھیں زباں اردو صاف
کس قدر با محاورہ شفاف

لکنت ان کی زبان میں ہو کیا دخل
گنجلک ان کے بیان میں ہو کیا دخل

ان کی تقریر بھی شریفانہ
یوں ہی سارنگ تھا ظریفانہ

میرے عموئے نامدار غیور
جو کہ ہیں سارے شہر میں مشہور

فوج شاہی میں تھے کمان افسر
ان کے احسان ان کے والد پر

غدر میں اپنے گھر کر کے تھاں
دشمنوں سے بچائی اس کی جان

گو کہ وہ معرض خطر میں رہے
مگر آرام سے یہ گھر میں رہے

عورتوں میں بڑی ملنساری
مدتوں تک یہ رسم تھی جاری

میم صاحب کبھی یہاں آئیں
کبھی میری چچی وہاں جائیں

آدمی روز آتے جاتے تھے
حصے بخرے بھی آتے جاتے تھے

میم صاحب تھیں اپنے دل سے نیک
ہر بڑے دن کو بھیجتی تھیں کیک

باغ سے ان کے پھول آتے تھے
ان کی بیری کے بیر جاتے تھے

مدتوں تک یہ رسم جاری تھی
واہ کیا پاس وضع داری تھی

اگلے لوگوں میں کیا محبت تھی
کس قدر بے ریا محبت تھی

گو کہ مذہب خلاف تھا ان کا
قلب اندر سے صاف تھا ان کا

یہ مسلمان تھے وہ عیسائی
کچھ نہ ہرگز دلوں میں بات آئی

وہ تعصب کو جانتے ہی نہ تھے
ایسی باتوں کو مانتے ہی نہ تھے

ذکر مذہب تھا ان میں ناممکن
دل دکھائیں کسی کا کیا ممکن

کس سے پوچھیں کدھر گئے وہ لوگ
ہائے افسوس مر گئے وہ لوگ!

جس زمانے میں تھی یہ رسم و راہ　　جن دنوں تھا یہ چاہتوں کا بناہ
صوفیہ سے ہوئی مجھے الفت　　بڑھ گئی رفتہ رفتہ کچھ وحشت
بڑھ گیا ارتباط حد سے سوا　　ہوگیا اختلاط حد سے سوا
دل نازک کا خون ہو ہی گیا　　رفتہ رفتہ جنون ہو ہی گیا
بس کہ یہ ربط جانبین سے تھا　　کل اسے تھی نہ میں ہی چین سے تھا
سوئے ظن پر نظر نہ تھی ہم کو　　نیک و بد کی نہ تھی خبر ہم کو
دل میں کچھ خوف والدین نہ تھا　　میرے دیکھے بغیر چین نہ تھا
دونوں کے دل میں چور اگر ہوتا　　کیوں نہ ہم کو کسی کا ڈر ہوتا

جب نہ ہو کچھ تو دل میں شک کیوں ہو
ملنے جلنے میں پھر جھجک کیوں ہو

عشق صادق تھا پاک الفت تھی　　مجھ سے بڑھ کر اسے محبت تھی
وہ لڑک پن وہ کھیل کود کا سن　　یاد آتے ہیں اب وہ عیش کے دن

وہ زمانہ جو یاد آتا ہے
دل پہ اک سانپ لوٹ جاتا ہے

جب کہ عمو نے انتقال کیا　　میں نے اپنا عجیب حال کیا
بچپنے سے انھوں نے پالا تھا　　ہوش میں نے وہیں سنبھالا تھا
ان کو مجھ سے کمال الفت تھی　　مجھ کو ان سے بڑی محبت تھی
پھر چچی صاحبہ نے رحلت کی　　ان کو بھی موت نے نہ مہلت دی
اسی اثنا میں مر گئے صاحب　　اس جہاں سے گذر گئے صاحب
میم صاحب بھی کر چکی تھیں قضا　　صوفیہ گھر میں ہو گئی تنہا
الغرض دونوں گھر تباہ ہوئے　　ہم ادھر وہ ادھر تباہ ہوئے

گو کہ جانا مرا مناسب تھا | بعض وجہوں سے نامناسب تھا
گرچہ دعویٰ تھا جاں فشانی کا | خوف تھا مجھ کو بدگمانی کا
گو کہ یارائے ضبط مجھ کو نہ تھا | مگر ایسا بھی خبط مجھ کو نہ تھا
کہ مری وجہ سے وہ ہو بدنام | ایسی باتوں کا تھا برا انجام

کہ مبادا اسے ضرر پہنچے
دور تک عشق کا اثر پہنچے

اس کے بعد اپنی بے قراری اور صوفیہ کی لگاوٹ بناوٹ اور کھنچاوٹ کا تذکرہ کر کے اس شعر تک مثنوی کہی ہے:

سر پر آئی بلا نہیں ٹلتی
سچ تو یہ ہے قضا نہیں ٹلتی

یہاں تک پہنچ کر مثنوی ناتمام چھوڑ دی ہے مگر اس قصے کو امراؤ جان نے مکمل کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"مرزا رسوا کے چچا کے مرنے کے بعد ان کی کل جائداد پر ان کی چچا زاد بہن قابض ہو گئیں۔ چچا نے اپنی زندگی میں چاہا تھا کہ اپنی لڑکی کے ساتھ جواب، جائداد پر قابض ہوئیں نکاح کر دیں مگر آپ نے نہیں معلوم کس وجہ سے انکار کر دیا تھا، غالباً اس کی وجہ صوفیہ کی محبت ہو مگر اس کا حال ٹھیک معلوم نہیں، اتنا جانتے ہیں کہ چچا زاد بھائی بہن میں چچا کی زندگی تک بڑا میل رہا مگر جب ان کی شادی ہو گئی وہ محبت بالکل عداوت سے بدل گئی، اس سبب سے ان کو چچا کے مرنے کے بعد بھی اپنی فکر کرنی پڑی۔ خیر چچی جب تک بھی زندہ رہیں وہ بھی ان کو سمجھایا کیں، ان کے مرنے کے بعد ان کو سب سے بڑھ کر مشکل یہ ہوئی کہ رہنے کا ٹھکانہ تک نہ رہا، اگرچہ مکان موروثی تھا مگر ان کے والد محجوب تھے اس لئے ان کا کوئی حق مکان میں نہ تھا۔ چچا زاد بہن کے ساتھ رہنا اور ان کے ٹکڑے کھانا اگر میں بھی ہوتا تو کبھی یہ گوارہ نہ کرتے اور

اب تو بگاڑ تھا۔ اس زمانے میں ان کی ایک کھلائی بوا گل چہرہ ان کے کام آئی، انھیں کے پاس رہنے لگے۔ اسکول میں نام لکھوالیا، انگریزی پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں درحقیقت بہت پریشان تھے مگر ایک تائید غیبی ہوئی جس کا بیان لطف سے خالی نہیں۔ یہ حال ہم کو ان کے ہم مکتب دوست کی زبانی معلوم ہوا۔ اس زمانۂ افلاس میں ایک دن یہ اپنے درجے میں بیٹھے پڑھ رہے تھے اتنے میں اسکول کے صاحب نے انھیں بلوا بھیجا اور ایک لفافہ جیب سے نکالا اور ان کا اور ان کے چچا کا نام دریافت کر کے کہا کہ تمھارے نام کسی نے یہ نوٹ سو روپے کا بھیجا ہے۔ لفافہ اور چٹھی ہمارے نام کی ہے مگر کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا۔ مرزا رسوا نوٹ اور وہ لفافہ اور چٹھی لے کر چلے آئے۔ یہ تائید غیبی صرف ایک مرتبہ نہیں ہوئی بلکہ زمانہ طالب العلمی میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی مگر اس طرح کے خطوط سب صاحب کی معرفت آیا کیے، اس لئے اکثر لوگوں کو یہ حال معلوم تھا۔ ان کو مدرسہ میں پڑھتے کوئی چھ سات برس گذرے ہوں گے کہ مس صاحبہ کا علاقہ اور جائداد کورٹ سے چھوٹا اور وہ لکھنؤ آکر اپنی کوٹھی میں رہنے لگیں مگر معلوم نہیں انھیں کیا ہوگیا تھا نہ جاتا تھا نہ گئے۔ اس زمانے کے حالات، مرزا رسوا نے خود نظم کئے ہیں وہ ہم تحریر کئے دیتے ہیں۔ ان مضامین میں ہم کو شاعرانہ آورد معلوم ہوتی ہے۔ مرزا صاحب اپنے خیالات کو اچھی طرح نہیں بیان کرتے، بہت کچھ چھپاتے ہیں مگر چھپ نہیں سکتا۔ اس میں ایک خاص باریکی ہے جس کو ناظرین سمجھ لیں گے۔ یہ خیال اس وقت کے ہیں جب وہ پہاڑ سے آچکی تھیں۔

تمھارے دل میں ایک یہ بھی خیال
میں ہوں نادار وہ ہے صاحب مال
اجنبی قوم غیر مذہب ہے
بات اتنی بھی جائے جواب ہے

اس کے بعد امراؤ جان نے مرزا صاحب کے ۲۱ شعر نقل کئے ہیں، جن میں مرزا نے اپنی مفلسی کا رونا رویا ہے اور اپنے دل کو یہی اونچ نیچ سمجھا کر نصیحت کی ہے۔

بھول جاؤ اب اس زمانے کو

مرزا رسوا تو شاید اس زمانے کو بھول جاتے مگر صوفیہ بھولنے والی تھوڑی تھی۔ اس نے ایک خط لکھ کر مرزا صاحب کو پھر متوجہ کر لیا۔ اس خط کو ناولٹ رسوا سے امراؤ جان اداتے نقل کیا ہے جو آپ کے بھی ملاحظہ میں پیش ہے:

خط میں تحریر تھا ڈیر رسوا — مدتوں سے تجھے نہیں دیکھا
ہم پہ کیا کیا مصیبتیں گذریں — کیسی کیسی قیامتیں گذریں
تم نے اک دن خبر نہ لی آ کے — یہ توقع ہمیں نہ تھی تم سے
کیا بزرگوں ہی تک تھی غم خواری — کیا ہوئی ہائے وہ ملنساری
یاد کیوں کر نہ آئیں اگلے لوگ — فی الحقیقت وہی تھے اچھے لوگ
تم سے پاپا کو کیا محبت تھی — ماڈیر کو بھی تم سے الفت تھی
سامنے ان کے آتے تھے اکثر — کھیلتے کودتے تھے دن دن بھر
ان کے مرتے ہی تم نے منہ موڑا — اس طرف کا خیال ہی چھوڑا
تم وہ سب رسم و راہ بھول گئے — دوستی کا نباہ بھول گئے
کیا وہ بچپن کے کھیل یاد نہیں — وہ لڑکپن کے میل یاد نہیں
ابھی اجڑا نہیں وہ گھر وہ باغ — دور اتنا نہیں وہ گھر وہ باغ
چلتے پھرتے اگر نکل آتے — آپ کے پاؤں کچھ نہ تھک جاتے
کس قدر تم بھی بے مروت ہو — نوج تم سے کسی کو الفت ہو
وہ تو ہے ساتھ چولی دامن کا — کہیں ملتا ہے دوست بچپن کا
مجھ کو گھر کا پتہ نہ تھا معلوم — تم کہاں ہو ذرا نہ تھا معلوم
کھد گیا جب سے وہ قدیم مکاں — نہیں معلوم مجھ کو ٹھیک نشاں
تم بہت یاد آتے ہو کل سے — خط لکھا ہے یہ میں نے اٹکل سے

سنتی ہوں مسارٹیز میں ہو تم　　جو یہ سچ ہے تو خط نہ ہوگا گم
کیا عجب ٹھیک وقت پر پہنچے　　جلد لکھنا جواب اگر پہنچے
بلکہ کیا ہے جواب کی حاجت　　خود ہی آؤ اگر ملے فرصت
جانتی ہوں سبب نہ آنے کا　　لغو ہے عذر منہ چھپانے کا
تم ہو انسان تو میں بھی ہوں انساں　　کیا سمجھتے ہو تم مجھے ناداں
میں سمجھتی ہوں ہاں غیور ہو تم　　زعم باطل میں اپنے دور ہو تم
خیر یہ ہے کہ دل سے ہو تم صاف　　دوستانہ شکایتیں ہوں معاف

منتظر لطف بے نہایت کی
آپ کی دوست بے ریا صوفی

اس خط کے آنے کی مرزا صاحب کو کتنی مسرت تھی، ان اشعار سے ظاہر ہے:

بادۂ مشکِ یار لا ساقی　　میں پیوں اور تو پلا ساقی
اب نہیں تاب انتظار مجھے　　بھر کے دے جام خوشگوار مجھے
مرحبا یا نصیب یا قسمت　　راہ پر آئے تم خوشا قسمت
آسماں مجھ کو دے مبارک باد　　کہ ہوا قید غم سے میں آزاد
قاصد شوق حرز جاں لایا　　نامۂ یار مہرباں لایا
میں ہوں اب اور آستان حبیب　　نہ غم پاسباں نہ خوف رقیب
خانۂ دل سے کلفتیں نکلیں　　حسب دل خواہ حسرتیں نکلیں
مل گئی غم کی داد منہ مانگی　　پائی دل کی مراد منہ مانگی
آج گویا کہ ہے برات کی رات　　اور ہے انتظار رات کی رات

مژدہ اے دل کہ عید کا دن ہے
مژدہ اے چشم دید کا دن ہے

یہ رات مرزا صاحب نے بڑی تکلیف سے بسر کی :

دل سے چلے ہزار کر کرکے — رات کاٹی خدا خدا کرکے
صبح ہوتے ہی اٹھ کے بستر سے — ہاتھ منھ دھو کے ہم چلے گھر سے
عازم کوئے گل عذار ہوئے — جا کے اس شوخ سے دوچار ہوئے
دوستانہ ملی وہ جان جہاں — اس کی باتوں پہ دل ہوا قرباں

ادھر سے شکوے شکایتیں تھیں اور ادھر سے ٹال مٹول تھا۔

ذکر افلاس نامناسب تھا
ان سے کہتے یہ کیا مناسب تھا

آخر خوشامد منت کر کے اپنی خطائیں معاف کرالیں اور صفائی ہوگئی۔

پھر خطائیں مری معاف ہوئیں
گتھیاں جو پڑی تھیں صاف ہوئیں

اور پھر :

باتوں باتوں میں اس نے سحر کیا — ہاتھ میں ہاتھ دے کے قول لیا
پھر ہوئے درفشاں لب گفتار — اس طرح حرف زن ہوئی وہ نگار
بات یہ ہے کہ میں ہوں عورت ذات — اور علاقہ کی فکر ہے دن رات
مجھ سے یہ کام ہو نہیں سکتا — کچھ سرانجام ہو نہیں سکتا
اس میں کچھ جد و کد کی حاجت ہے — کچھ تمھاری مدد کی حاجت ہے
میرے لائق یہ کاروبار نہیں — غیر کا مجھ کو اعتبار نہیں
اپنے ذمے یہ کام لو مجھ سے — اختیارات عام لو مجھ سے
ہو کے میری طرف سے تم مختار — جانچ لو کاغذات اسامی دار
خود علاقے کا بندوبست کرو — جو کہ سرکش ہوں ان کو پست کرو

نوکری کا نہ سلسلہ سمجھو
اس کو اپنا معاملہ سمجھو

مرزا صاحب نے لاکھ جان چھڑانی چاہی کہ میں نہ تجربہ کار ہوں مگر کوئی عذر پذیرا نہ ہوا۔

الغرض بعد حجت و تکرار — اس نے ضد کر کے لے لیا اقرار
دوسرے دن سے کام کرنے لگا — گھر کا سب انتظام کرنے لگا

یہ ناتمام مثنوی یہاں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد امراؤ جان یوں حاشیہ آرائی فرماتی ہیں :

"خلاصہ تقریر کہ مرزا رسوا کے نام مختار نامہ ہو گیا .... مرزا رسوا اور مس صاحبہ کے تعلقات ویسے ہی تھے جو انگریزی منگیتروں کے سنے جاتے ہیں، انگوٹھیاں بدل گئی تھیں، چاہ اور نباہ کے اقرار ہو چکے تھے، ظاہر میں بالکل انداز عاشقی معشوقی بلکہ میاں بیوی کا تھا، دلوں میں پاک بازی تھی، آتش شوق کے شعلے بلند تھے، دونوں ایک ہی آگ میں جل رہے تھے ...."

"اسی اثناء میں مس صاحبہ نے بمبئی جانے کا ارادہ ظاہر کیا، مرزا رسوا سے کہا تم یہیں ٹھہرو میں سات آٹھ دن بعد چلی آؤں گی مگر انہیں تاب کہاں تھی، ساتھ چلنے کے لئے ضد کی، آخر انہیں بھی ہمراہ لیا۔ دونوں خوشی خوشی بمبئی روانہ ہوئے، وہاں جا کے ہوٹل کے دو کمرے کرایہ پر لئے، ایک میں مرزا رسوا کو اتارا دوسرے میں خود اتریں۔ بمبئی کی خوب سیریں ہوئیں، صبح سے گاڑی پر سوار ہو کے شام تک گشت کرنا، جب کھانے کا وقت آیا کسی ہوٹل میں اتر پڑے، کھانا کھا لیا یا گاڑی پر ساتھ لے لیا۔ راتوں کو تھیٹروں میں جانا، غرض کہ ایک ہفتہ خوب جشن کیا۔ ایک دن سر شام مس صاحبہ نے کہا میرے سر میں درد ہے آج میں تماشہ میں نہ جاؤں گی، کھانے دانے سے فراغت کر کے نو بجے سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ مرزا رسوا بھی اپنی جگہ سو رہے۔ دوسرے دن صبح کے وقت چائے پر انتظار کرنے لگے، کیوں کہ صبح کے وقت، دونوں ایک ساتھ چائے پیا کرتے تھے۔ آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی تھی مس صاحبہ برآمد نہ ہوئیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مرزا نے انتظار کیا اس خیال سے

کہ شاید رات مزاج درست، نہ تھا صبح کو آنکھ لگ گئی ہوگی۔ جب بہت دیر ہوئی تو کمرے کے دروازے پر جاکر کھٹکھٹایا، کوئی آواز نہ آئی۔ مرزا رسوا دل میں کہتے ہیں یا اللہ کیا ماجرا ہے، کمرے میں بلا اجازت جانا انگریزی تہذیب کے خلاف ہے مگر کہاں تک انتظار کیا جاتا آخر دروازہ کھولا، پہلے آواز دی جب جواب نہ آیا اندر گئے، دیکھا مس صاحبہ ندارد ہیں، کمرہ خالی پڑا ہے۔ مرزا رسوا کی آنکھوں میں اندھیرا سا آگیا۔ ہوٹل کے نوکروں سے پوچھا، معلوم ہوا مس صاحبہ نے رات کے گیارہ بجے گاڑی مانگی تھی، سوار ہوکر کہیں گئیں۔ اب تو مرزا رسوا کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے، کیوں گئیں؟ کہاں گئیں؟ اسی شش و پنج میں تھے کہ لکھنے کی میز پر ایک لفافہ مس صاحبہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے نام ملا، جلدی جلدی لفافہ کھولا، لکھا تھا:

"میرے پیارے! تم میرے دفعتاً بے اطلاع غائب ہوجانے سے ملول نہ ہونا، بات یہ ہے کہ بمبئی میں صرف سیر و سیاحت کے لیے نہیں آئی تھی، مجھے لکھنؤ میں معلوم ہوا تھا کہ میری پھوپھی جو پیرس میں رہتی تھیں کروڑوں کی جائداد چھوڑ کر انتقال کر گئیں، میرے سوا ان کا کوئی وارث نہیں ہے۔ ان کے مختار کے خط سے معلوم ہوا کہ وصیت نامہ بھی میرے نام کر گئیں ہیں مگر اس کے لئے مجھ کو پیرس جانا ضروری ہے، ایک تو حساب کے لیے دوسرے اس مطلب سے کہ وہاں اکثر اراضی اور مکانات ہیں ان کو فروخت کرنا اور روپیہ نقد کر لینا ہے۔ میں تمھیں اپنا شوہر اور لکھنؤ کو اپنا وطن سمجھتی ہوں اور درحقیقت ایسا ہی ہے مگر اس معاملہ کے لئے (تم سمجھ سکتے ہو کہ) میرا جانا ضروری ہے اور تم کو ساتھ نہ لے جانے میں یہ مصلحت تھی کہ ولایت کے لوگ جن میں اکثر میرے دور کے رشتہ کے عزیز بھی ہیں تمھیں ہمراہ دیکھ کر برا مانتے اور شاید میرے معاملات میں کچھ مشکلیں پڑ جاتیں بلکہ ممکن تھا کہ ناکامی ہوتی۔ وہاں کے اکثر لوگ مجھے اتنی بڑی جائداد کی وارث سمجھ کے امید موہوم میں خوشامد سے کام کریں گے۔ یقین ہے کہ بہت جلد کل جائداد نقد و جنس میرے قبضے میں آجائے، میرے اندازے میں تین ماہ میں بالکل فرصت ہوجائے گی اور اس کے بعد میں دم بھر وہاں نہ ٹھہروں گی۔ اس درمیان میں تم کو خط لکھتی رہوں گی۔ اس میں شک نہیں کہ تم مجھے وفادار جانتے ہو مگر مزید

اطمینان کے لئے میں نے لکھنؤ کی کل جائداد کا بیع نامہ تمہارے نام کردیا ہے، کاغذات ضروری میرے بکس میں موجود ہیں۔ جس وقت تم کو یہ خط ملے گا میں بمبئی سے بہت دور نکل گئی ہوں گی۔ جہاز مر دیسبرگ نامی ٹھیک سوا بارہ بجے روانہ ہوگا جس سے میں فرانس جا رہی ہوں۔ تم آج سے لکھنؤ چلے جاؤ اور تین مہینے انتظار کرو پھر خدا وہ دن کرے گا کہ ہم تم دونوں باغ کے صحن میں شام کو بیٹھے ہوں گے، گانا ہوتا ہوگا، تم اپنی غزلیں پڑھتے ہوگے میں سنتی ہوں گی چند روز اور انتظار کرو فقط۔

۱۸۰۰ء راقمہ

تمہاری صوفیہ"

"مکرر یہ کہ میرے باغ کو درست رکھنا، جرانیم کے درخت، جو میں نے لگائے ہیں ان کا مجھے بہت خیال ہے مالی پر تاکید رکھنا۔ جانے نہ پائیں"۔

اس خط کو دیکھ کر مرزا رسوا کے دل پر جو صدمہ گذرا گذرا مگر پھر دل کو تسکین دے کر لکھنؤ چلے آئے۔ ایک خط عدن سے آیا تھا، دو تین خط پیرس سے آئے تھے ان میں مقدمات کا مفصل حال تھا۔ اس کے بعد پیرس سے روانہ ہوتے وقت تار دیا "آج ہم یوٹوپیا جہاز پر ہندوستان روانہ ہوتے ہیں"۔ تار کے آنے کے بعد دن کیسے مرزا رسوا گھڑیاں گننے لگے مگر وہ جہاز نہ آج آتا ہے نہ کل۔ مرزا رسوا کے دوستوں کا اور ہی خیال ہے مگر اس کا مناسب نہیں، سمجھنے والے سمجھ ہی لیں گے۔ روز سر شام تمام باغ میں چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ درختوں کی ایک ایک پتی دھوئی جاتی ہے، جا بجا فانوس روشن کر دیئے جاتے ہیں، صحن میں چبوترے پر دو کرسیاں بچھائی جاتی ہیں، جرانیم کے ناندے گرد لگائے جاتے ہیں، مرزا رسوا خود بیٹھتے ہیں، غزلوں کی بیاض سامنے رکھی جاتی ہے، ایک کرسی کے سامنے ارگن باجا لگا دیا جاتا ہے، نگاہیں دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں، آج تک معشوقہ دنادار کا انتظار ہے، اس کو پندرہ برس ہوگئے مگر ان کے جوش و خروش میں کسی طرح کمی نہیں ہوئی۔ دن بھر اچھے رہتے ہیں مگر شام کو اس جنون کا دورہ ہوتا ہے، دل قابو سے نکل جاتا ہے، خدا ان کے حال پر رحم کرے۔

موت آجائے گی اک دن یہی کہتے کہتے   آج آتا ہے کل آتا ہے کہیں سے کوئی!

امراؤ جان کے اس بیان کو غلط سمجھنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں ہے۔ مرزا صاحب کی سنک اس کا یقین دلاتی ہے کہ واقعی انھیں جنون تھا اور وہ آلودہ قلب یا دل زدہ تھے۔ ایک کسک ایک جلن ان کے دل میں تھی اور آخر میں وہ بڑے رقیق القلب ہو گئے تھے۔ بات بات پر آب دیدہ ہو جاتے تھے۔

امراؤ جان نے ۱۸۹۹ء میں نالۂ رسوا شائع کی ہے اور وہ لکھتی ہیں کہ یہ واقعہ پندرہ سال پہلے کا ہے۔ اس طرح یہ معاشقہ ۱۸۸۴ء کا قرار پاتا ہے جب کہ مرزا ۲۷ سالہ جوان تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثہ کے بعد ہی مرزا کابل گئے اور پھر واپس آکر ملازم ہوئے اور بی۔ اے پاس کیا۔ بہرحال واقعہ چاہے کسی زمانے کا ہو مگر صحیح ضرور معلوم ہوتا ہے یا پھر غلط ہو تو اس کی دلچسپی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

بیشتر لوگوں کو یہ ماننے میں تامل ہے کہ امراؤ جان ادا کوئی جیتی جاگتی ہستی تھی بلکہ لوگ اسے مرزا کا تخلیقی کردار تصور کرتے ہیں۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے اور امراؤ جان کو مرزا کا اپج یا تخلیقی کردار سمجھا جائے تو کتاب کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ کسی فرضی واقعہ یا تخلیقی کردار کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ حقیقت بن جائے:

معجزہ گر نیست کرامات ہست!

وہ صناع کامیاب ترین فن کار ہوتا ہے جو اپنی تخلیقات کو حقیقت کا جامہ پہنا کر پیش کرے اور اس عمدگی سے تخلیق کرے کہ ہر شخص اس کردار کو حقیقی مانتے، ایسے صناع کو زندہ جاوید ہونا چاہئے۔

فردوسی طوسی نے بڑی غلطی کی جو شاہنامہ لکھنے کے بعد یہ کہہ کر مزا کرکرا کر دیا کہ:

منش کردہ ام رستم داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

اور ادبیات سے ہمیں غرض نہیں اردو ادب میں بعض صناعوں نے بعض کردار بڑے اچھے تخلیق کیے۔ شرر کوئی اچھا تخلیقی کردار پیش نہ کر سکے۔ سرشار نے خوجی کا کردار پیش کیا۔ داستان گویان ہند نے عمر و عیار اور صاحب قراں کا کردار پیش کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ابن الوقت اور ظاہر دار بیگ

کی تخلیق کی۔ سجاد حیدر یلدرم نے مرزا پھویا سے روشناس کرایا۔ سجاد حسین نے حاجی بغلول کو جنم دیا، بعض اور فن کاروں نے بعض کردار پیش کئے مگر کسی پر حقیقت کا شبہ تو الگ رہا گمان تک نہ ہو سکا۔ مرزا رسوا ہی ایک ایسے فن کار ہیں جن کے کردار "امراؤ جان ادا" کو فرضی اور تخلیقی ماننے کو جی نہیں چاہتا۔

قدیم جرمن مفکر سائی سانگ (ZEISSANG) کے نظریہ GOLDEN SECTION کو مشہور مفکرین FECHNER اور VERNONLEE کے بہت آگے بڑھایا ہے جو یہ ہے کہ:

"ہر حسن کار خواہ وہ شاعر ہو یا مصور یا موسیقار یا مجسمہ ساز یا کچھ اور، اپنی نظر احساس اور تخلیل میں ہمیشہ ایک قسم کا PATTERN یعنی نقش یا خاکہ دیکھنے، تصور کرنے اور بنانے کی پراسرار صلاحیت رکھتا ہے۔ ساری کائنات اس کی نظر میں رنگ، خط، تناسب، توازن، نور، ظلمت، خیر یا شر کا ایک نقش نظر آتی ہے جسے وہ متشکل کرنے اور نمود کا ایک قالب عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حسن کار کی آنکھیں ایک کیمرہ بن جاتی ہیں اور دل، دماغ اور روح مصور بن جاتے ہیں۔"

وہی حسن کار کامیاب فن کار ہے جو اپنے دل و دماغ سے کام لے اور ایک تصویر بنا کر اسے چلتی پھرتی بولتی چالتی بنادے اور اس طرح پیش کرے کہ دنیا اس کی تخلیق کو اس کی اختراع فاسقہ کو اس کے شاہکار کو اصل سمجھ لے۔

میرڈیتھ نے اپنے لافانی ناول EGOIST میں مرکزی کردار دلوّبی کو اس مکمل طریقے سے پیش کیا کہ ہزاروں لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ انھیں کا حال لکھ رہا ہے چنانچہ ایک نوجوان غصہ میں بھرا ہوا اس سے لڑنے کے لئے جا پہنچا کہ تم نے دلوّبی کے پردے میں میری تصویر کھینچ کر مجھے رسوا کیا ہے ——— یہی کردار نگاری کا کمال ہے۔

اگر آپ ہم یہ مان بھی لیں کہ امراؤ جان ادا، ایک تخلیقی کردار ہے تو بھی ناول پڑھنے کے بعد یہ ماننے میں تامل ہوتا ہے اور دل نہیں مانتا کہ یہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، بولتی چالتی تصویر خیالی ہو سکتی ہے۔

حیدرآباد دکن

۶، فروری ۱۹۵۶ء

تمکین کاظمی

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن، اب تمہیدِ ذکرِ دردِ ماتم ہو گئیں

ناظرین! شانِ نزول اس قصہ کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے، کہ میرے ایک دوست منشی احمد حسین صاحب اطراف دہلی کے رہنے والے بہ طریق سیر و سیاحت لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے چوک میں سید حسین کے پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سرِ شام آبیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا اس لئے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرے پر سرِ راہ بیٹھتے دیکھا، نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل بند رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگر اس میں کرّا پڑا ہوا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ احباب داد دے رہے تھے، اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا اور

احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسین نے پکار کے کہا "غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں۔ اگر شوق شعر و سخن ہے تو جلسہ میں تشریف لائیے"۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا۔ بات رفت گذشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک 'مہری' آئی اس نے پہلے سب کو سلام کیا پھر یہ کہا "مرزا رسوا کون صاحب ہیں؟" احباب نے مجھے بتا دیا۔ مہری نے کہا "بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے"۔ میں نے کہا "کون بیوی؟" مہری نے کہا "بیوی نے کہہ دیا ہے نام نہ بتانا، آگے آپ کا جو حکم ہو"۔ مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے "ہاں صاحب کیوں نہیں، کبھی کی صاحب سلامت ہے جب تو اس طرح بلا بھیجا"۔ میں دل میں غور کر رہا تھا کہ کون صاحب ایسے بے تکلف ہیں۔ اتنے میں ادھر مہری نے کہا کہ "حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں جب تو بلا بھیجا ہے"۔ آخر جانا ہی پڑا۔ جا کے جو دیکھا معلوم ہوا۔ آہا امراؤ جان تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان: (دیکھتے ہی) اللہ! مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔

میں: یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کوہ قاف میں تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان: یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی لیکن کبھی بلانے کی جرأت نہ ہوئی مگر آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منھ سے واہ نکل گیا۔ ادھر کسی صاحب نے کہا "یہاں آئیے"۔ میں اپنی جگہ پر آپ ہی شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ رہوں مگر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجئے گا۔ ہاں وہ شعر ذرا پھر پڑھ دیجئے۔

میں: معاف تو کچھ بھی نہ ہوگا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلئے۔

امراؤ جان: مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں، مگر خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔

میں: آپ کے حواس درست ہیں؟ بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لئے کیوں کہتا، بے تکلف صحبت ہے۔ آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔

امراؤ جان : یہ تو سچ ہے مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو۔

میں : جی نہیں۔ وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

امراؤ جان : اچھا تو کل آؤں گی۔

میں : ابھی کیوں نہیں چلتیں ؟

امراؤ جان : اے ہے دیکھئے تو کس حیثیت سے بیٹھی ہوں۔

میں : وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے چلی چلئے۔

امراؤ جان : اوئی مرزا ! آپ کی تو باتیں لاجواب ہوتی ہیں۔ اچھا چلئے میں آتی ہوں۔

میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحبہ ذرا کنگھی چوٹی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔ لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ تک نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انھوں نے کچھ گایا۔ احباب محظوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لئے جاتے تھے، صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا !
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا : کیا کہنا ہی امراؤ جان صاحبہ ! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے، اور شعر

کیوں نہ ہو۔

امراؤجان: تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مطلع خدا جانے کس زمانے کی غزل کا ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے۔ بیاض نگوڑی گم ہوگئی۔

منشی صاحب: اور وہ مطلع کیا تھا ہم نے نہیں سنا۔

رسوا: آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں سنے کون۔

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لئے بڑے سلیقہ سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد ہے۔ اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالوں کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذ کی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ٹیڑھے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دئے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اس لئے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دور کے لئے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب، خان صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لائے۔ پہلے شیر فالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا، پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب: تو پھر اہتمام آپ کیجئے بندہ شعر سنے گا۔

رسوا: معاف فرمائیے۔ یہ درد سر مجھ سے نہ ہوگا۔

منشی صاحب: اچھا وہ مطلع کیا تھا؟

امراؤجان: میں عرض کئے دیتی ہوں۔

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب : خوب کہا ہے۔

خاں صاحب : اچھا مطلع کہا ہے مگر یہ 'بھول گیا' کیوں ؟

امراؤجان : تو کیا خاں صاحب میں ریختی کہتی ہوں۔

خاں صاحب : مزا تو ریختی کا ہے "مرے مولا نے خیر کی" آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔

رسوا : بس آپ کے حملے شروع ہو گئے۔ لے شعر سننے دیجئے خاں صاحب ! اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزا تشریف لے جائے۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

خاں صاحب : (کسی قدر برے تیوروں سے) درست۔

رسوا : امراؤجان ! اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو۔

امراؤجان : دیکھئے کچھ یاد آئے تو عرض کروں ، (تھوڑی دیر کے بعد)۔

شب فرقت بسر نہیں ہوتی

(حضار جلسہ : واہ وا ! سبحان اللہ ! کیا کہنا)

امراؤجان : (تسلیمیں کرکے) یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

شور فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

رسوا : کیا شعر کہا ہے۔

(حضار نے بھی تعریف کی)

امراؤجان : آپ کی عنایت۔ تسلیم تسلیم۔

ترے کوچے کے بے نواؤں کو ہوسِ مال و زر نہیں ہوتی

(احباب : تعریف)

امراؤ جان : تسلیم۔

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا : واہ خاں صاحب ! یہ شعر ملاحظہ ہو۔

خاں صاحب : سبحان اللہ ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان : آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں ع ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

ہے یقیں وہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خاں صاحب : یہ بھی خوب کہا۔

پنڈت صاحب : کیا طرز کلام ہے۔

امراؤ جان : (تسلیم کر کے)۔

اب کس امید پر نظر میری
شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی

خاں صاحب : کیا اچھا کہا ہے۔ فارسیت ٹپک رہی ہے۔

منشی صاحب : جو کچھ ہو۔ مضمون اچھا ہے۔

امراؤ جان : تسلیم۔

ہم اسیران عشق کو صیاد
ہوس بال و پر نہیں ہوتی

(احباب : تعریف)

امراؤ جان : تسلیم۔

غلط انداز ہی سہی وہ نظر کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خاں صاحب : ہاں ہونا چاہیئے۔ خوب کہا ہے۔

امراؤ جان : مقطع ملاحظہ ہو۔

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

خاں صاحب : کیا مقطع کہا۔ یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں اور لوگوں کی رائے اسس کے خلاف ہے۔

امراؤ جان : ذاتی تجربہ جو کچھ ہو میں نے ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔

رسوا : اچھا، ذرا پھر تو پڑھیئے۔

امراؤ جان نے پھر پڑھا۔

رسوا : مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکل سکتے ہیں۔

خاں صاحب : واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی۔

احباب : غزل از مقطع تا مطلع ایک رنگ ہے۔

آغا صاحب : نشست الفاظ تو ملاحظہ ہو۔

پنڈت صاحب : کیا درفشانی کی ہے۔

امراؤ جان : (کھڑی ہو کے) تسلیم۔

منشی صاحب : اب آپ کچھ ارشاد کیجئے۔

خاں صاحب : حضرت مجھے تو معاف کیجئے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

رسوا : کچھ تو پڑھیئے۔

خاں صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے۔

حیف بنت العنب نہیں ملتی ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا : کیا اچھا کنایہ ہے۔ یعنی شب چار دھم۔

خاں صاحب : تسلیم۔

یوں تو ملتی ہے داد صنعت شعر
داد حسن طلب نہیں ملتی

رسوا : کیا اچھا کنایہ ہے۔ یعنی شب چار دہم۔

خاں صاحب : تسلیم۔

شوخیوں سے کسی کی میری مراد
پہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی

رسوا : لاجواب شعر ہے۔

خاں صاحب : تسلیم۔

(اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ساتھ میں لالٹین تھی)

خاں صاحب : یہ کون صاحب آئے ہیں۔ شب ماہ میں لالٹین کی کیا ضرورت تھی؟

نواب صاحب : حضرت حماقت تو ہوئی، معاف کیجئے گا۔

خاں صاحب : اخاہ نواب صاحب! بہ حضور مضائقہ ندارد۔

(نواب صاحب تشریف لائے۔ سب نے تعظیم کی۔ غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی)

نواب صاحب : میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

شیخ صاحب : جناب غزل پڑھنا ہوگی۔

نواب صاحب : اچھا جو کچھ یاد آتا ہے عرض کئے دیتا ہوں۔

دل میں کھب جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک
کارگر ہوگا کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

(احباب : واہ کیا شعر کہا ہے)

نواب صاحب : تسلیم۔ (اس کے بعد چپ ہو رہے)

رسوا : اور کچھ ارشاد ہو۔

نواب صاحب : واللہ اب کچھ یاد ہی نہیں آتا۔

منشی صاحب : اب آپ داد فصاحت دیجئے۔

پنڈت جی : امتثالاً للامر دو تین شعر عرض کئے دیتا ہوں۔

وصل میں ذکر عدو بھی دم بدم ہوتا رہا
شربت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

(احباب : تعریف)

پنڈت صاحب :

زاہد و دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا
ورنہ کعبہ میں سدا ذکر صنم ہوتا رہا

نواب صاحب : ہم نہیں کہہ سکتے مگر خوب کہا۔

پنڈت صاحب : کہئے یا نہ کہئے مگر بات یہی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

واعظا کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو
جس کا سر نقش قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

(احباب : تعریف)

پنڈت صاحب :

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دئے
مو بمو حال پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوا : یہ خاص لکھنؤ کا مذاق ہے۔

پنڈت صاحب : اور آپ دہلی کے کب ہیں ؟

رسوا : اچھا شعر پڑھیئے۔ میں نے تو ایک بات کہی۔

پنڈت جی :

دل جو تھا پہلے گلِ نورستۂ باغ مراد
خار خار حسرت رنج والم ہوتا رہا

نواب صاحب : دیکھئے کیا شعر کہا ہے۔

خاں صاحب : متانتِ الفاظ ملاحظہ ہو۔

پنڈت جی : مقطع ملاحظہ ہو۔

شکریہ مخمور اس کا کب ادا تجھ سے ہوا
ہر نفس تجھ پر جو خالق کا کرم ہوتا رہا

خاں صاحب : سبحان اللہ ! ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات۔

رسوا : خاں صاحب آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے۔

احباب : سبحان اللہ ! کیا غزل فرمائی ہے۔

پنڈت جی : آپ کی عنایت ، پرورش ، بندہ نوازی۔ واللہ یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے۔

منشی صاحب : شیخ صاحب آپ تو کچھ ارشاد کیجئے۔

شیخ صاحب : (مسکراکر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

خاں صاحب : یاد نہیں ، مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہوگی

شیخ صاحب : واللہ نہیں۔ صرف چار شعر ابھی موزوں کر لئے ہیں۔

رسوا : تو پھر پڑھتے کیوں نہیں۔

شیخ صاحب : عرض کئے دیتا ہوں۔

عرض وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو ۔۔۔ بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

(احباب : تعریف)

شیخ صاحب : تسلیم۔

مثل یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہو
کیا ہی شرماؤ اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسوا : کیا اچھا مذاق ہے۔

شیخ صاحب : تسلیم۔

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جچے
جنس وہ خوب کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خاں صاحب : بہت خوب۔

شیخ صاحب : تسلیم۔

قتل عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسین کو دیا۔

منشی صاحب : (رقعہ پڑھ کے) لیجئے مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے غزل تازہ بھیج دی ہے۔

میں نے آدمی سے پوچھا "کیا کر رہے ہیں؟"

آدمی : (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سر شام بہت سے انگریزی درختوں کے نانڈرے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر سجا رہے ہیں۔ مالی پانی دیتا جاتا ہے۔

رسوا : جی ہاں انھیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرے میں تشریف لائیں۔

منشی صاحب : اچھا تو غزل پڑھ دیجئے۔ واللہ کیا صحبت کو بے لطف کیا۔ نہ آئے نا؟ اچھا

غزل ہی پڑھ دیجئے۔

رسوا: مجھ سے تو کچھ نہ پڑھوائیے گا؟

منشی صاحب: ہاں خوب یاد آیا۔ اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجئے۔

رسوا:

نہ پوچھو ہم سے کیوں کر زندگی کے دن گذرتے ہیں — کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا — عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکرتے ہیں
ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوقِ جراحت پر — نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں
تماشہ ہو جو ان کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں — بہت جو چاہنے والوں کا دل لے کر مکرتے ہیں
انھیں کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے — کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں
بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بننا نہیں ممکن — وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں
کبھی شانے سے الجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا — سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی — دوپٹہ اوڑھ کر اڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں

ادا سے ناز کو رسوا ہے دعویٰ پارسائی کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

احباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوا نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا شروع کی۔

کل رات کو انھیں جو کہیں دیر ہو گئی — دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات — تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں — ان موذیوں سے عقل اگر زیر ہو گئی
اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ — ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
میری تباہیوں کی تمھیں اب خبر ہوئی — کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی تیر ہو گئی

آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ کیا تو ہے · دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی
ٹلنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے · کمبخت تو تو آکے یہیں ڈھیر ہو گئی
دبکی ہوئی تھی گربہ صفت خواہش گناہ · چمکارنے سے پھول گئی شیر ہو گئی

مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تا چند انتظار ؟ بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد مظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ تھے۔ انھوں نے یہ نظم پڑھی :۔

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال · جس کی اب نقل کرتے ہیں نقال
روش اہل فن پہ ہنستے ہیں · رنگ بزم سخن پہ ہنستے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توبہ · شاعری کی یہ قدر ہے توبہ
گو کہ پاس ادب نہیں کرتے · ہجو کچھ بے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعران خوش تقریر · اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر
کب سخن ور اکیلے جاتے ہیں · قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں
جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت · ساتھ ہوتے ہیں بے شمار پھندیت
جن کے ہمراہ یہ ہجوم نہ ہو · کبھی ان کی غزل کی دھوم نہ ہو
اک ادھر واہ واہ کرتا ہے · اک ادھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرز درفشانی ہے · واہ کیا وضع خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے واہ کیا کہنا · فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا
اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی · کب ہے استاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں · واقعی فخر میر و مرزا ہیں

کب میسر تھا ان کو حسن کلام / کچھ نہ تھے وہ، فقط ہے نام ہی نام
ان کے دیواں میں کب یہ نشتر ہیں / بہ خدا آپ ان سے بہتر ہیں
ان سے واللہ آپ اچھے ہیں / ثم باللہ آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز / نکتہ سنجی ہے یا کہ ہے اعجاز
آپ قدرت نمائے معنی ہیں / فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منہ کھولے / کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصہ / ہے یہ اعجاز آپ کا حصہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور / آپ ہی آپ ہیں نہیں کچھ اور
آپ ایسے ہیں آپ ویسے ہیں / ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں / پوچھئے ہم سے آپ کیا جانیں
آپ کا کام ہے ہوا بندی / آپ پر ختم ہے ادا بندی
ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا / نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
الغرض بے تکی اڑاتے ہیں / بچھے جاتے ہیں لوٹے جاتے ہیں
ان کی تعریف ہے وہ لاطائل / جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل
منہ سے وہ شعر ادھر نکلتے ہیں / یہ ادھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں
جن کی تعریف کا تھا یہ مذکور / اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور
اگر اس میں کسی کو غصہ آئے / کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے
نہیں یہ بات کچھ تعجب کی / بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی
پڑھتے ہیں لفظ لفظ رک رک کے / ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے
گو بظاہر ہے انکسار بہت / دل میں ہے جوش افتخار بہت
کس قدر تنتے ہیں بررتے ہیں / خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں

ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح | ہوتی ہے بات بات کی تصریح
کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق | جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق
کس قدر دور ہیں معاذ اللہ | کیسے مغرور ہیں معاذ اللہ
نکتہ فہم ایسے نکتہ داں ایسے | شاعر ایسے ہیں قدرداں ایسے
جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا | جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا
اس میں کیا حظ ہے یہ مزا کیا ہے | کوئی پوچھے انھیں ہوا کیا ہے
گو کہ میری مذمتیں ہوں گی | میں سمجھتا ہوں جو گتیں ہوں گی
صاف گوئی کی داد پاؤں گا | میں بھی اپنی مراد پاؤں گا
کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈروں | بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزروں
مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی | بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی
طرز اہل سخن سے ناخوش ہوں | روش اہل فن سے ناخوش ہوں

شاعری ہے اگر اسی کا نام
دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔
ہر شعر پر اہل محفل تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب پر وجد کا عالم طاری تھا۔ امراؤ جان جھوم رہی تھیں اور میرا جو حال تھا وہ میرے دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب: ہاں جناب آغا صاحب اب آپ کچھ فرمائیے۔

آغا صاحب: بہت خوب۔ مطلع اول ملاحظہ ہو۔

کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
مٹر ابلے ہوئے ہوں اور اک ٹھرے کی بوتل ہو

احباب: آغا صاحب کیا مطلع فرمایا ہے۔

آغا صاحب : اے حضرت ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔ دوسرا مطلع سنئے۔

وہ مضمون ڈھونڈھ کر باندھوں کہ جو اشکل سے اشکل ہو
کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اول سے اول ہو

احباب : بے شک اول سے اول ہے۔

آغا صاحب : لے اب شعر ملاحظہ ہوں۔

اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتہ ہلکا بادامی رنگا اور باریک ململ کا انگرکھا پہنے بند کھولے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی اسے جھلتے جاتے تھے۔

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ کمل ہو

(احباب : تعریف)

آغا صاحب : شعر ملاحظہ ہو۔

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں
کہ چرلے ناقۂ لیلیٰ ہری جب دل کی کوپل ہو

پنڈت جی : سبحان اللہ ! اور تو اور، یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے۔

احباب : واللہ سمجھے بھی خوب۔ سمجھ ہو تو ایسی ہو نہیں تو نہ ہو۔

آغا صاحب : نہ ہو۔ اچھا اب یہ شعر سنئے :۔

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں
رکے گا راستہ گھر کا، اگر کوچہ میں دلدل ہو

شیخ صاحب : اچھی کہی۔

رسوا : (خاں صاحب سے) آپ کیوں سکوت میں ہیں، کوئی اعتراض نکالیے۔

آغا صاحب : ہاں جناب سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے۔

خاں صاحب : آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھئے اس لئے چپ ہوں۔

آغا صاحب : نہیں حضرت میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔

(احباب اس فقرہ پر لوٹ گئے)

آغا صاحب : شعر سنئے :-

ہمیں رشک آئے اپنے سے ہمیں سے غیر پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب : آغا صاحب سبحان اللہ ! کیا نازک خیالی ہے۔

آغا صاحب :

ابھی کمسن ہیں ان کو شوق ہے لنگر لڑانے کا
تکلا ؟ ڈور کا ہو اک نہ کن کیا نہ تکل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی طرف تھا اس لئے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب :

کوئی ان سے کہے جو شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا راز سربستہ جو دروازہ مقفل ہو

رسوا : آغا صاحب کیا کہنا۔ امراؤ جان ! ذرا سننا کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ جان : سبحان اللہ ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو چاہیں کہیں مالک ہیں۔

آغا صاحب : تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنئے ؛

کسی صورت سے بہلالیں گے اس معشوق کمسن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو ریوڑی نہ ہو تو گول گپل ہو

(احباب : کیا کہنا)

آغا صاحب :

کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ارزل ہو

خاں صاحب : درست ، مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔

آغا صاحب : جناب شریف کون ہے اس زمانے میں۔

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی تسفتل ہو

نواب صاحب : خوب ، مگر روئے سخن کس کی طرف ہے ؟

آغا صاحب : یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں اس لئے کہ آپ محرم راز ہیں السر عند اکرام الناس مکتوم۔

خاں صاحب : آپ جواب دیجئے۔

آغا صاحب : آپ کیا جواب دیں گے ، یہ شعر سنئے :

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھلبل ہو

(احباب : واہ ری ہمت)

آغا صاحب : اچھا نہ سہی۔ یہ سنئے۔

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

(احباب : خوب)

آغا صاحب :

تمھاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو نہ مسی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان : اوئی، تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھا رہے۔

آغا صاحب : سادگی کا یہی مزا ہے اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے۔ (اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر حسین مشہور تھیں)

ٹکا ہم سے وہ جب مانگیں انھیں چپکے سے ہم دے دیں
نہ بک بک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ کچ ہو نہ کل کل ہو

(احباب : کیا مصرع کہا ہے)

خاں صاحب : اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا۔ وہی ازل کی رعایت چلی آتی ہے۔

(امراؤ جان ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں)

آغا صاحب : اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں، ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا ہے۔ نازک خیالی سنئے :

تری نازک کمر کے باب میں چھلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ باریکی طبیعت جس کی گٹھل ہو

خاں صاحب : میں تسلیم کئے لیتا ہوں میری طبیعت ایسی ہی ہے جیسا آپ ارشاد فرماتے ہیں، مگر برائے خدا اس چھلک کے معنی سمجھا دیجئے۔

آغا صاحب : خیر، خاطر ہے سن لیجئے۔ محاسب لوگ خانہ پری کے بجائے ندارد کے نشان بنا دیا کرتے ہیں اس لئے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم ہے دوسرے ایک خط نے بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی اور پھر جڑی ہوئی بھی ہے۔

خاں صاحب : یہ کیوں کر؟

آغا صاحب : اب اس باریکی کو نہ پوچھئے۔ خیر حضرات واضح ہو کہ چھلک علم ریاضی میں علامت

جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی۔ مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصوں کو جوڑے ہوئے ہے۔

احباب : حضرت ! بس نازک خیالی کی حد ہوگئی۔ جو کوئی اتنے علم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔

آغا صاحب : اسی لئے تو میں ایسے ویسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس استاد مرحوم زندہ نہ ہوئے نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر اب مقطع سن لیجئے۔ طبیعت کو کلفت ہو گئی کوئی قدر دان نہیں ہے۔

بس اے قزاق بس اطبع قیامت خیز کو رد کو
غضب ہو جائے گا فوج مضامیں میں جو ہلچل ہو

احباب : مقطع پھر عنایت ہو۔

(آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا)

نواب صاحب : کیا زبردست تخلص رکھا ہے۔

آغا صاحب : معاف فرمائیے گا۔ ہے تو کچھ ایسا ہی۔ مگر کچھ نازیبا نہیں ہے۔ ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لئے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشت قفچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ ایسا مناسب نہ تھا اس لئے کہ (ان کی روح شرمندہ نہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کئے۔ سارا دیوان ملاحظہ کر لیجئے۔ شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔

جب اشہب خامہ کی لگام میرے دست اقتدار میں آئی تو میں نے سرقہ کو اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن تو ہے۔ بندہ کا یہ دستور رہا ہے کہ شعرائے ماضی وحال کے مضامین زبردستی چھین کے اپنے قبضۂ تصرف میں کر لوں گا۔

نواب صاحب : بہت مبارک۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسہ کی برف جمائی گئی۔ اس کی دو دو قفلیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دسترخوان بچھا۔ منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب: (امراؤ جان سے) ذرا اپنا مطلع تو وہ پڑھئے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔

کس کو سنائیں حال دلِ زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب: اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دلچسپ ہوں گے جب سے آپ نے یہ مطلع پڑھا ہے مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگذشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی۔ مگر امراؤ جان پہلو بچاتی تھیں۔ ہمارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ الف لیلیٰ امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستان خیال کی کل جلدیں نظر سے گذری ہوئی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہل زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی۔ اکثر ناول نویسوں کے بے تکے قصے مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی تقریریں آپ کے دل سے اتر گئی تھیں۔ لکھنؤ کے بامذاق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آئی تھی۔ امراؤ جان کے اس مطلع نے آپ کے دل میں خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتعالک نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگذشت کہنے پر مجبور ہو گئیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی اور کیوں نہ ہو اول تو خواندہ، دوسرے اعلیٰ درجہ کی رنڈیوں میں پرورش پائی۔ شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی۔ محلات شاہی تک رسائی۔ جو کچھ انھوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہوگا۔

اپنی سرگذشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں میں ان سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ اس پر امراؤ جان بہت بگڑیں مگر اب کیا ہوتا تھا۔ آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جا بجا جو کچھ رہ گیا تھا اسے درست کر دیا

میں امراؤ جان کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب ان کی نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ انھیں دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگذشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے حرف بہ حرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ مگر یہ میری ذاتی رائے ہے ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کر لیں۔

—— مرزا رسوا

۱

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنئے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگذشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد، آوارہ وطن خانماں برباد، ننگ خاندان، عار دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنئے اور اچھی طرح سنئے:

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے کچھ بہشتی کچھ نائی۔ دھوبی، کہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ

دم بھر کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابا ابا کر کے دوڑا، دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھیا کو گود میں اٹھالیا۔ پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر میں نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں کبھی بتاسوں یا تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھیننے لئے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا ادھر آکے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہو گئے "ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے۔ بمبئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں میں تو نیا جوڑا پہنوں گی"۔ جب اماں کھانا پکا چکیں مجھے آواز دی۔ میں گئی روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا۔ اماں نے کھانا نکالا۔ سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے نماز پڑھی اسی وقت میں کھٹک سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

"میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا....."

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے، کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوائیں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیوں کہ ابا پہر دن چڑھتے سے پہلے ہی نوکری پر چلے

جلتے تھے۔ اماں سینا پرونا لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی یا دروازہ پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی۔ ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے۔ بھیا کو بٹھادیا خود کھیل میں مصروف ہوگئی۔ ہائے کیا دن تھے کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیوں کہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں۔ کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے تو لوگ انھیں جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی۔ ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی مگر پچی اور بھیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہ رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پاجامہ چھوٹے چھوٹے پانچوں کا ٹول کا نیفہ۔ نینو کی کرتی تن زیب کی اوڑھنی۔ ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں گلے میں طوق ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان

میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع، دروازنے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت، بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں، کتاروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں، کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولھا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا، بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے، کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہوگیا تھا۔

رات کو ابّا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں، میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دُولھا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہم سن تھی) کے دولھا سے اچھی ہے وہ تو کالا کالا ہے میرا دولھا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولھا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے میرے دولھا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولھا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے۔ ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے۔ میرا دولھا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا، سبز چھینٹ کا ڈگلا گلبدن کا پائجامہ مصالحہ کی ٹوپی مخملی جوتا۔ کریمن کا دولھا سر میں ایک پھنٹیا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چنداڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا۔ موا چاندی کا تھا شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں۔ اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لیئے اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انھوں نے انگلی خالی دیکھی مجھ سے حال پوچھا۔ اپ کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منھ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے انھوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیئے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا کی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا۔ مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا۔ گود میں اٹھا لیا۔ پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں جلدی سے اتار دیا اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھڑکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہوگئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کو نیند حرام، کسی سے دوا پوچھتی ہیں کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لئے اپنے گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لئے باقی نکال کے الگ کر دئے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا وہ جی ہوگا! تمھاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمھاری بہن ہیں سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح تو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں، ان کا تو ذکر ہی کیا جو کچھ نہ کریں کم ہے۔ کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں، ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے۔ مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوگا کہ کمبخت آور ماتی ؟ کتھی شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب کبھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی ماں باپ نے جہاں پایا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا۔ یا بد صحبت ملی آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی

نہ تھا۔

دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ مواڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لئے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ آہ بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ رانی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "دل جمعدار! تم سچ سچ کہو یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ انھیں کی گواہی پر دلاور خاں قید ہوگیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا۔ لینے کو گئے نہ دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے، جھٹ پٹے وقت میں خدا جانے میں کیوں نکلی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں، املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے، کہنے لگا "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دے گئے تھے کبوتر لے لو"۔ میں اس کے دم میں آگئی۔ ساتھ چلی گئی۔ جاکے جو دیکھتی ہوں گھر میں کانی چڑیا نہیں، اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کرلی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دئے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا، وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کہ آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کے مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی، تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر، کروں کیا کوئی بس نہیں، موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہل کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے، ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے، بیل ہیں کہ اڑے چلے جارہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہوگئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

جاڑے کے دن تھے۔ سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باران جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا ہے ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہوگا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں، باپ، بھائی مکان کا دالان انگنائی، باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہوگی۔ گو دڑ اب میرے منھ میں نہ تھا مگر مارے ڈر کے منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں : دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کا پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا ... تلملاتا پھرتا ہوگا۔

پیر بخش : بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمھیں قید ہوئے۔

دلاور خاں : پورے بارہ برس ہوئے، بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں؛ خیر... وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش : کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں : تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش : بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے۔

دلاور خاں : دیکھنا۔

پیر بخش : اور اسے کیا کروگے ؟

دلاور خاں : کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ دل میں ایک دھچکا سا لگا۔ من کا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دئے۔ یہ حال دیکھ کے بھی موئے کٹڑ کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش : اسے تو مار ڈالوگے اور ہمارا روپیہ ؟

دلاور خاں : گلے گلے پانی۔

پیر بخش : کہاں سے دوگے ؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلاور خاں : گھر چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کے دے دوں گا۔

پیر بخش : تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں۔

دلاور خاں : کہو۔

پیر بخش : اماں لکھنؤ میں چل کے اس چھوکری کے کوڑے کر لو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہوگیا تھا مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔

پیر بخش کی باتیں سن کر میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھو یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں : اچھا دیکھا جائے گا ابھی چلے چلو۔

پیر بخش : یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔ وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھریں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا، مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ

تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے، اک بارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے "حرامزادی چپ نہیں رہتی ابھی چھری بھونک دوں گا ..... فیل کرتی ہے ...."

پیر بخش : (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) نہیں بھئی نہیں ایسا کام نہ کرنا۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم۔ ارماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں : اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں : (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے تک بک جائے گی ؟ اور بیچے گا کون ؟ ایسا نہ ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش : اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں، پکڑے گا کون ؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو ؟

دلاور خاں : کریم !

پیر بخش : ہاں۔ اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا۔ لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لئے۔

دلاور خاں : آج کل کہاں ہے ؟

پیر بخش : کہاں ہے ؟ لکھنؤ میں گومتی اس پار اس کی سسرال ہے وہیں ہوگا۔

دلاور خاں : بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں ؟

پیر بخش : جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں : بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی ؟

پیر بخش : سو ڈیڑھ سو جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں : بھائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے ؟ سو بھی تو بہت

ہے۔

پیر بخش : اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو۔ مار ڈالنے سے کیا فائدہ ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا "وہ تو ہم سمجھے ہی تھے۔ تم کیا ایسے بیوقوف ہو"۔

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ طاقت سلب ہوگئی تھی۔ بدن سن ہوگیا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے، تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منھ پر سے کمل سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں، پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے پکے مکان ہیں، ایک بنئے کی دکان ہے، دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں، بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں، دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے تاپ رہے ہیں، ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آکے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دئے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لاکے دیا، میں نے تھوڑا سا پیا پھر چپکی ہوکے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی، پھر پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھڑکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش دونوں جگہ جگہ پہ حقہ بھر بھر کے پیتے تھے۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوج ہونے لگی۔ آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے دوسرا ادھیں گلا گھونٹنے کو

تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گذشت ہوئی۔ پھر ملاپ ہوا دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے

ایک : ہمارے تمھارے لڑائی کی، ہی کیا بات تھی۔

دوسرا : بات، ہی کیا تھی۔

پہلا: اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا : جانے دو۔

۲

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شبِ اوّل ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شبِ اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی، مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیوں کر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکین ہوئی۔ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کوؤں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح و شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیسے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔

بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کر روؤں ....

آپ میری آوارگی کی سرگذشت سن کے کیا کیجئے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجئے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبہ نہ لگتا۔ یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔ ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ کب اس کو دیکھا تھا، اس کو ایک

زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مرگئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے ماشاءاللہ چودہ پندرہ برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپئے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانہ میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا راستہ تھا۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کریں نہ معلوم کن بیہڑ راستوں سے لایا کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لئے جاتے ہیں۔ لکھنؤ کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا ہی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لئے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انھیں اچھی طرح پہچانتی تھی۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لاکر اتارا۔ چھوٹا سا کچا مکان۔ کریم کی ساس موئی مردے شوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی۔ ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھنؤ پہنچی تھی، دوپہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچہ بھر ماش کی دال اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہو گئی۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز نہ ہو سکتی تھی۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا کوئی آس نہ پاس۔ پھر اوڑھنی سے منھ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آ گئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ بیٹھی۔

"لونڈیا کتنی سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے اٹھایا سانس ہی نہ لی میں تو سمجھی تھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لودہ تو پھر اٹھ بیٹھی"۔

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک چکی تو پوچھنے لگی۔ ....

"پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھا دیا وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آکے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گذرے۔ تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی اسی کوٹھری میں لاکے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی چھکو پھکو روتی تھی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔

کسی بنئے کی لڑکی تھی۔ رام دئی نام تھا، سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا میں نے اسے دیکھا۔ گوری گوری تھی بہت خوبصورت ناک نقشہ، ڈیل ذرا چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو پہر دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور پیر بخش نے مجھے آکے نکالا، اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان پھر ایک بازار میں سے ہو کر گذری۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد ایک بازار پھر ملا۔ اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک چلنا پڑا۔ پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی

بھیڑ تھی، راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی، یعنی چوک۔ اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت عزت، بدنامی، نیک ناجی، زرد روئی، سرخروئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ سے چڑھ کے اوپر گئی۔

مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف ایک دالان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ، سفید، کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے مشروع کا پائجامہ، بڑے بڑے پائچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے، کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انھیں کا سا تھا مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔ کنول روشن ہے، بڑا سا نقشی پان دان آگے کھلا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان: یہی چھوکری ہے؟

دلاور خاں: جی ہاں۔

مجھے پاس بلایا چمکار کے بٹھایا۔ ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم جان: اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے۔ اور دوسری چھوکری کیا ہوئی؟

پیر بخش : اس کا تو معاملہ ہو گیا۔

خانم : کتنے پر؟

پیر بخش : دو سو پر۔

خانم : اچھا، خیر۔ کہاں ہوا؟

پیر بخش : ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحب زادے کے واسطے مول لیا ہے۔

خانم : صورت شکل کی اچھی ہے۔ اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش : میں کیا کروں۔ میں نے تو بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خاں : صورت تو اس کی بھی اچھی ہے، آگے آپ کی پسند۔

خانم : خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خاں : اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے۔

خانم : اچھا تمھاری ہی ضد سہی۔

یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔

خانم : حسینی!

حسینی : خانم صاحب۔

خانم : صندوقچہ لاؤ۔

حسینی گئی صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحبہ نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے دئے تھے۔

ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردے نے اپنے ڈپ میں رکھے۔ دونوں سلام کرکے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔

خانم صاحب : (حسینی سے) حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں کی مہنگی تو نہیں معلوم

ہوتی۔

حسینی : مہنگی ! میں کہتی ہوں سستی۔

خانم : سستی بھی نہیں ہے۔ خیر ہوگا، صورت تو بھولی بھولی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے۔ ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں، ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی ! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے، ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی : خانم صاحب ! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں۔

خانم : سنا کیوں نہیں۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا سیخچوں سے داغ کے مار ڈالا۔

حسینی : دنیا میں جو چاہیں کرلیں، قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منھ کالا ہوگا۔

خانم : منھ کالا ہوگا ! جہنم کے کندے پڑیں گے۔

حسینی : خوب ہوگا۔ موئیوں ؟ کی یہی سزا ہے۔

اس کے بعد بوا حسینی نے بڑی منت سے کہا :

"بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجیئے۔ میں پالوں گی۔ مال آپ کا ہے، خدمت میں کروں گی۔"

خانم : تم ہی پالو۔

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں۔ اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں۔ مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔

حسینی : بچی ! تو کہاں سے آئی ہے ؟

میں : (رو کے) بنگلے سے۔

حسینی : (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے ؟

خانم : اے ہے کیا ننھی ہو؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں۔
حسینی : (مجھ سے) تمھارے ابا کا کیا نام ہے ؟
میں : جمعدار۔
خانم : تم بھی غضب کرتی ہو۔ بھلا وہ نام کیا جانے ابھی بچہ ہے۔
حسینی : اچھا تمھارا نام کیا ہے ؟
میں : امیرن۔
خانم : بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کہہ کے پکاریں گے۔
حسینی : سنا بچی ! امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی 'امراؤ'، تم کہنا 'جی'۔

اس دن سے امراؤ میرا نام ہوگیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی، لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔

خانم صاحبہ مرتے دم تک امراؤ کہا کیں۔ بوا حسینی امراؤ صاحب کہتی تھیں۔ اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا، مٹھائیاں کھلائیں، منھ ہاتھ دھلایا، اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات کو میں نے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری پر سے آئے ہیں، مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے۔ چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے، اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔ اماں باورچی خانے میں ہیں۔ اتنے میں ابا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے بیدار کیا۔ آنکھ جو کھلی کیا دیکھتی ہوں نہ وہ گھر ہے نہ دالان۔ ابا ہیں نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پوچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن تھا۔ میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے آنسو بھی برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں، میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا۔ اول تو مجبوری دوسرے نئے ڈھنگ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی آگاہ نہ تھی۔ کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے تماشے، میلے باغوں کی سیر، وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کڑ دل کی تھی کہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں بسر کرنا ہے۔ جیسے نئی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لئے آئی ہوں، ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں موئے ڈکیتوں کے ہاتھ سے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف ۸۰ کوس ہے مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔

۳

اک حال میں انساں کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بدل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا، کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرے تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید مری ہم سِنیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ، ہر وقت بنی ٹھنی تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنے رہتے تھے، وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نہیں نصیب ہوتے۔ خانم کا مکان تھا کہ ایک پرستان تھا۔ جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق، گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔ اگرچہ میں کمسن تھی مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے، اپنے مطلب کی سمجھتی تھی۔ بسم اللہ، خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کے میرے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی۔ اسی عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آستائی شروع کرا دی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کومل سے

اَت کومل۔ سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیورتر ہو جائے۔ اور میری بھی حجتیں کرنے کی عادت تھی۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے۔

ایک دن خانم صاحب کے سامنے میں رام کلی گا رہی تھی، دھیوت سدھ لگا گئی۔ استاد جی نے نہ ٹوکا۔ خانم صاحب نے پھر اسی کو کہوایا۔ میں نے پھر اسی طرح کہا۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے۔ خانم صاحب نے گھور کے دیکھا۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی۔ انھوں نے سر جھکالیا۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔

خانم: استاد جی! یہ کیا تھا۔ رام کلی میں اوچار دھیوت سے ہے اور وہی سر ٹھیک نہیں۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا سدھ؟

استاد: کومل۔

خانم: او چھوکری! تو نے کیا کہا تھا؟

استاد: سدھ۔

خانم: پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں؟

استاد: کچھ مجھے خیال نہیں رہا۔

خانم: واہ۔ خیال کیوں نہیں رہا۔ اسی لئے میں نے دوبارہ کہوایا۔ پھر بھی آپ منہ میں گنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی کسی سمجھ دار کے سامنے اسی طرح گاتی تو کیا وہ میرے جنم میں تھوکتا۔

استاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوئے چپ ہو رہے مگر دل میں بات لئے رہے۔ استاد جی اپنے کو نائک سمجھتے تھے اور تھے بھی ایسے ہی۔ اس دن خانم کا ٹوکنا ان کو بہت ہی ناگوار ہوا۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی ہوں۔ خانم بھی موجود ہیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا گندھار اس میں کومل ہے یا اَت کومل؟

استاد جی : ات کومل۔

خانم : خاں صاحب ! ماشاءاللہ۔ یہ میرے سامنے۔

استاد : کیوں ؟

خانم : اور پھر آپ مجھی سے پوچھتے ہیں کیوں ؟ سوھا میں گندھارات کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہئے۔

استاد : (کہنے لگے) گندھار کومل لگا گئے۔

خانم : بس آپ ہی قائل ہوجئے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بھکلتے ہیں یا مجھے کستے ہیں خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں۔ خاک چاٹ کے کہتی ہوں، گلے سے نہ ادا ہو مگر ان کانوں نے کیا نہیں سنا۔ میں کبھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتائیے نہیں تو معاف کیجئے میں اور کوئی بندوبست کرلوں گی۔ چھوکریوں کو غارت نہ کیجئے۔

استاد جی : بہت خوب۔

یہ کہہ کے اٹھ گئے، کئی دن نہیں آئے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ جی بیچ میں پڑے۔ قسما قسمی ہو کے ملاپ ہوگیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا۔ وہ خانم کو اتنا نہ سمجھتے تھے۔ عمر بھر مجھے حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی۔ کیوں کہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوئیں استاد جی ان کو نہ بتا سکتے تھے، یا جان بوجھ کے بتاتے نہ تھے۔ لاکھ قسما قسمی ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ گر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہوگیا تھا کہ جہاں کسی بات میں شک ہوا یا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں، استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت ہی خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوئی مگر ٹپہ، ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس پر بھی لے سے ہا نون رہیں۔ خورشید کی

آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی گلا ایسا جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ ان کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جائے۔

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں۔ مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا توا، اس پر چیچک کے داغ، پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جائے، لال لال آنکھیں، بھدی ناک بیچ میں سے پچکی ہوئی، موٹے موٹے ہونٹ۔ بڑے بڑے دانت۔ فربہ انتہا سے زیادہ۔ اس پر ٹھنگنا قد، بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کستے تھے۔ مگر قیامت کا گلا تھا۔ معلومات بہت اچھی تھی۔ مور چھنا انہی کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب ان کے کمرے میں جانکلتی مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی۔

میں : باجی ہاں! ذرا سرگم تو کہنا۔

بیگا : سنو! سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی۔

میں : میں یہ نہیں مانتی۔ سرتیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔

بیگا : لڑکی! تو تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔

میں : اللہ باجی تمھیں بتا دو۔

بیگا : سارے گا ما پا دھا نی۔ دیکھ بائیس ہوئیں۔

۴ ۳ ۲ ۴ ۴ ۳ ۲

میں : (شرارت سے) اوئی، میں نے نہیں گنیں۔ پھر کہو۔

بیگا : جا اب نہیں کہتی۔

میں : واہ، میں تو کہوا کے چھوڑوں گی۔

بیگا : (پھر وہی کہہ دیا) لے اب نہ ستا۔

میں : ہاں اب کی گنیں۔ نکھادیں دو ہیں نا؟

بیگا : ہاں دد۔
میں : تو ٹھیک بائیس ہوئیں۔ اچھا لے اب تینوں گرام کہہ دد۔
بیگا : لے اب ٹہلیئے۔ کل آئیے گا۔
میں : اچھا طنبورہ اٹھالاؤں کچھ گاؤ۔
بیگا : کیا گاؤں ؟
میں : دھناسری۔
بیگا : کیا گاؤں۔ آستائی۔ دہرپد۔ ترانہ ؟
میں : اللہ باجی دہرپد گاؤ۔
بیگا : لے سن۔

"تن کی تپ تپ ہی مٹے جب پیا کو درشٹ پھر دیکھوں گی
جب درشن پاؤں گی ان کو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی
اشٹ جام دھیاں موہے واکو رہت ہے نہ جانوں کب درشن تھیکوں گی
جو کو ہر پر بھو پیارے سے ملادے واکے پائن میں سیس ٹیکوں گی"

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لئے مکتب بھی تھا۔ مولوی صاحب نوکر تھے۔ حسب دستور میں بھی مکتب میں بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید کترواں داڑھی، صوفیانہ لباس، ہاتھ میں عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوتی، ہر وقت کی جریت، چاندی کی شام بہت ہی نفیس، ڈیڑھ خمہ حقہ، افیون کی ڈبیہ پیالی۔ غرض کہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا۔ وضعدار بھی ایسے کہ کسی زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا آج تک اسے نباہے جاتے تھے۔ بوا حسینی بھی انھیں دین ددنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔

مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر بر خدا کے دئے گاؤں گراؤں، مکان، بیوی، جوان لڑکے، لڑکیاں سب کچھ موجود تھا۔ مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لئے تشریف لائے، یہیں رہے۔ شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے کبھی کبھی کچھ آیا بھی کرتا تھا۔ دس روپیہ خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی کو ملتا تھا۔ کھانے پینے حقہ افیون کی تاک بوا حسینی لیتی تھیں۔ تحویلدار بوا حسینی تھیں۔ کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔ خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں، بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمہ لی تھی اس لئے مجھ پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے تھے۔ پاس ادب مانع ہے اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندۂ ناتراش کو انھوں نے آدمی بنا دیا۔ یہ انھی کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر و رئیس کی محفل میں گئی حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ انھی کی بدولت آپ ایسے لائق فائق صاحبوں کے جلسہ میں منھ کھولنے کی جرأت ہوئی۔ شاہی درباروں میں شرکت کا فخر حاصل ہوا۔ اعلیٰ درجے کی بیگمات کے محل میں گذر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے کے بعد کریما، ماقیما، محمود نامہ، صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس کے بعد گلستاں شروع کرا دی۔ دو سطریں پڑھاتے تھے۔ سبق حفظ کرایا جاتا تھا، خصوصاً اشعار۔ لفظ لفظ کے معنی، فقرے کی ترکیب نوک زباں تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت لی۔ املا درست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستاں کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی کی صرف و نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی۔ شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں۔ اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کی طرح
مکتبِ عشق و وفا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا۔ گوہر مرزا حد کا شریر اور بد ذات، سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لے لی۔ اِس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی۔ اس کے کان دکھا دئے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی، کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض کہ اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دکھیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے مگر اپنی آنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کے میری گت بناتا تھا کیوں کہ میں سب سے ایلی اور گیگلی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار [illegible] بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں بھی چغلیاں کھاتے کھاتے عاجز آگئی۔ میری فریاد [illegible] صاحب اس کو بہت ہی بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آجاتا تھا۔

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔

نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازہ میں رہتے تھے۔ ان سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ انہی سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوئے مدت گذر گئی تھی مگر دس روپیہ ماہ بہ ماہ لڑکے کی پرورش

کے دئے جاتے تھے۔ اور بیگم صاحبہ سے چوری چھپے کبھی کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ بنو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں، وہیں بوا حسینی کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے ذات شریف تھے۔ تمام محلہ کا ناک میں دم تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا، کسی لڑکے سے پرکوؤں کا پنجرہ دیکھنے کو مانگا۔ اس نے دے دیا آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی۔ سب پرکوے پھر سے اڑ گئے۔ غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز آکر محلہ کی مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے کرتے میں مینڈک چھوڑ دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی۔ ایک لڑکے کی جوتی اٹھا کے کوئیں میں ڈال دی۔

ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت نے ان کا نیا چڑھواں جوتا حوض میں پیرا دیا۔ خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں مولوی صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا اور کان پکڑے ہوئے بنو کے گھر پہ لے آئے۔ دروازے پر سے پکار کے کہا "لو صاحب اپنا لڑکا لو۔ ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔" یہ کہہ کے مولوی صاحب تو ادھر گئے گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے ہوئے روتا ہوا گھر میں آیا۔ اس وقت اتفاق سے بوا حسینی بنو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ حال دیکھا، آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ نہیں، مولوی صاحب کو برا بھلا کہنے لگیں۔

بوا حسینی: اے ہے مولوی کاہے کو موا قصائی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں کے سجا دیا۔ اے لو کان بھی لہولہان کر دئے۔ بی بی ایسے مولوی سے کوئی نوج پڑھوائے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار سے پڑھاتے ہیں۔

بنو نے چھوٹتے ہی کہا پھر بوا حسینی اس کو بلا کے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔

بوا حسینی : لے تو جاؤں مگر بہت دور ہے۔

بنو : تمہارے بھائی کے ہاتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی۔ شام کو بلا لیا کروں گی۔

بوا حسینی : اچھا تو بھجوا دیا کرو۔

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔ اس لئے بوا حسینی کو اپنی حسن خدمت پر پورا بھروسا تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لئے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی خوشی مٹھائی تقسیم کی۔ لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اسی طرح کئی برس گذر گئے۔ آخر میرے اس کے صلح ہو گئی یا یوں کہئے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہو گئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہو گا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو۔ جس زمانے کا حال لکھ رہی ہوں میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہو گا اور گوہر مرزا کا چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی، ڈومنی کا لڑکا تھا، قدرتی لے دار، بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ ادھر میں لے سر سے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے خوب جلسے ہوتے تھے۔ کبھی میں گانے لگی وہ بتانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز پر اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرے میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ایک ضروری بات تھی کیوں کہ بغیر میری اس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔ مرزا صاحب! آپ کو تو امیر

جان یاد ہوں گی؟

رسوا : یاد ہیں۔ کہے جاؤ۔

امراؤ : امیر جان کا وہ زمانہ جب مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں، اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ! وہ اٹھتی ہوئی جوانی۔

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت
بھولی بھولی وہ موہنی صورت
بانکی بانکی ادائیں ہوش ربا
ترچھی ترچھی نگاہیں قہر خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں۔

رسوا : اب تو میں نے جب ان کو دیکھا ہے انگلی پر ڈالنے کے لائق تھیں۔ ایسی بری صورت ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔

امراؤ : کہاں دیکھا تھا؟

رسوا : انہی کے گھر میں دیکھا تھا جن کے کمرے کے سامنے شاہ صاحب گیروے کپڑے پہنے ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لئے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا تھا اس کو سلام کر لیتے تھے۔ کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔

امراؤ : سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب ان کے عاشقوں میں تھے۔

رسوا : جی ہاں۔ کیا میں نہیں جانتا۔

امراؤ : اچھا! تو آپ وہیں رہتے ہیں۔

رسوا : ان کی مصاحبت میں ہوں۔

امراؤ : اور ان کا کیا حال ہے؟

رسوا: وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں۔

امراؤ: کون حکیم صاحب؟

رسوا: آپ نہیں جانتیں۔ نام بھی بتادوں گا تب بھی آپ نہ سمجھیں گی پھر کیا فائدہ۔

امراؤ: خیر کچھ بتادیجئے۔ میں سمجھ جاؤں گی۔

رسوا: وہ نخاس .....

امراؤ: خوب جانتی ہوں یہی امیر جان اس زمانے میں ایسی تھیں کہ لوگ ان کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے، چار چار مہریاں ساتھ، ایک گڑگڑی لئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لٹیا لئے، ایک کے پاس خاصدان ہے، خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں۔

امیر جان گوہر مرزا کے گانے پر غش تھیں۔ خود گانا دانا جانتی نہیں تھیں۔ مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی۔ صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا، اس پر نمک اور جامہ زیبی، شوخی، شرارت کوئی بات .....

رسوا: کیوں نہ ہو۔ کس ماں کا بیٹا تھا۔

امراؤ: اہاہ! تو کیا آپ نے بنو کو دیکھا تھا؟

رسوا: (مسکراتے ہوئے) جی ہاں آپ یہی قیاس کرلیجئے۔

امراؤ: مرزا صاحب آپ کے مذاق بھی کیا درپردہ ہوتے ہیں۔

رسوا: خیر! آپ نے تو پردہ فاش دیا۔

امراؤ: تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگذشت کو آگ لگایئے۔

رسوا : مذاق کے لئے شب بھر باقی ہے۔آپ اپنا قصہ کہئے۔

امراؤ : دیکھئے دوسری ہوئی۔اچھا سنئے :

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کس کی مجال تھی کہ دم بھر کے لئے کہیں کھسک جائے۔اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔پھر ایک ایک کمرہ ہے اور ہم ہیں۔آج امیر جان کے پاس، کل جعفری کے کمرے میں، پرسوں بن کے یہاں۔پھر جہاں جاؤ خاطر مدارات، میوہ مٹھائیاں حقہ پان۔

رسوا : آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟

امراؤ : جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی۔شوقیہ پیتی تھی، پھر تو نگوڑی لت ہوگئی۔

رسوا : گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے عجب نہیں آپ نے اس میں بھی ان کی ہوس کی ہو۔

امراؤ : خدا نے اس سے تو آج تک بچایا، مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی۔ وہ بھی اب شروع کی ہے۔کربلائے معلی سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی، آئے دن زکام رہتا تھا۔حکیم صاحب نے کہا "افیون کھاؤ" کھانے لگی۔

رسوا : اور وہ چیز نزلے کی روکنے والی۔

امراؤ : اب اس کا ذکر نہ کیجئے۔

رسوا : کیا تائب ہوگئیں؟

امراؤ : مدت سے۔

رسوا : واقعی کمبخت کیا بری چیز ہے۔اپنا تو یہ حال ہے۔

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی\
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ : ہائے کیا شعر کہا ہے مرزا صاحب۔ قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں، پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار ہے۔

رسوا : آپ بھی شغل کیجیے گا ؟

امراؤ : توبہ۔

رسوا : توبہ !

ابر بھی ہے ہوائے سرد بھی ہے
پھر وہ یادش بہ خیر یاد بھی ہے

امراؤ : لے بس اب طبیعت کو روکیے۔ جمائیاں آنے لگیں۔ اللہ اس ذکر کو جانے دیجئے۔

رسوا : جانے دیجئے۔

امراؤ : مذاق سے بھی معاف رکھئے۔

اب نہ ہم منھ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا : واللہ امراؤ جان کیا شعر کہا ہے۔

امراؤ : تسلیم۔

دیکھ کر مشہد ادا ان کو
لالہ د گل کی سیر یاد آئی

رسوا : ماشاءاللہ ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالم شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

امراؤ : جی نہیں، شراب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔

زاہدو ! آج ہم کو پھر وہ شے   جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی

رسوا : اہاہاہا۔ کیا قافیہ نکالا ہے۔ اور کہا بھی خوب۔

کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ
پھر دہی راہ دیر یاد آئی

امراؤ : اے کیا کہنا یہ "کعبہ سے پھر کے" کیا خوب کہا ہے۔ مرزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجئے۔

پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی
پھر دہی راہِ دیر یاد آئی

رسوا : خاصہ۔

امراؤ : روش دحش د طیر یاد آئی
دشت وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا : یہ بھی مطلع برا نہیں ہے۔

امراؤ : یہ شعر ملاحظہ ہو :

ہم کو بنت العنب سے شکوہ ہے
کیوں ہمیں اس بغیر یاد آئی

رسوا : میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجئے اور پھر اپنا قصہ دھرانا شروع کیجئے۔

ہوا بھی ابر بھی گلزار بھی شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اگلا سادہ شباب بھی ہو

امراؤ : واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل کو مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب۔ اس طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گذرے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جس کا بیان ضروری ہے۔

ہاں خوب یاد آیا۔ بسم اللہ کی مسی بڑے دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلارام کی بارہ دری اس جلسے کے لئے سجی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم، ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی، دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے۔ سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسا دل کھول کے حصے تقسیم کئے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاقان بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کم سن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کمپا مارا۔ بے چارے پھنس ہی تو گئے۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسہ میں خرچ ہوئے۔ اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہوئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا رسوا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بے باک ہوتی ہیں مگر زمانہ خاص ہوتا ہے۔ سن کا تقاضہ بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گذر جاتی ہیں سن اتر کر ان میں کمی ضرور ہونا چاہیئے تاکہ اعتدال قایم رہے۔ آخر رنڈیاں عورت ذات ہیں۔ ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فائدہ۔

رسوا: کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابل سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیئے۔

امراؤ: ادئی! تو کیا پڑھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا: اچھا۔ اچھا تو آپ کہئے فضول باتوں سے میرا وقت نہ ضائع کیجئے۔

امراؤ: کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجئے گا۔

رسوا : اور آپ کیا سمجھی ہیں۔

امراؤ : ہائے فضیحت ! توبہ کیجئے مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔

رسوا : خیر، اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں۔

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمھیں رسوا کئے بغیر

امراؤ : نوج آپ سے کوئی محبت کرے۔

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کئے بغیر

رسوا : کس کا شعر ہے ؟

امراؤ : یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں۔

رسوا : ہاں سمجھا۔ تو یہ کہئے آپ نے بھی یہ غزل سنی ہے۔

امراؤ :

جاتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کئے بغیر

رسوا : اور وہ شعر یاد ہے ؟ تقاضا کئے بغیر۔

امراؤ :

وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند
ملتا نہیں کچھ ان سے تقاضا کئے بغیر

رسوا : اور کوئی شعر یاد ہے ؟

امراؤ : اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔

رسوا : یہ تو بہت بڑی غزل تھی ، دیکھنا نقل کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔

امراؤ : انہی سے نہ منگوالو۔

رسوا : خود جا کے لکھ لاؤں تو ممکن ہے وہ ہرگز نہ لکھیں گے۔

امراؤ : یہ بھی کوئی بات ہے ؟

رسوا : جی ہاں آپ کو نہیں معلوم مسودے کے سوا غزل صاف کرنے تک کی قسم ہے۔

امراؤ : اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا۔

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہو
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کئے بغیر

اور سنئے :

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کئے بغیر

رسوا : میری بھی غزل اسی طرح میں تھی مگر خدا جانے کیا ہوئی صرف مقطع یاد رہ گیا ہے۔

امراؤ : مقطع پھر سنائیے۔ کیا خوب کہا ہے۔

رسوا :

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمھیں رسوا کئے بغیر

امراؤ : واقعی خوب کہا ہے مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

رسوا : تخلص کا ذکر نہ کیجئے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہئے میرا نام نہیں جانتے نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں۔ مگر میں تو

خوش ہوں اس لئے کہ انگریزی رسم کے موافق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں۔ جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا۔

لے اب ٹالیئے نہ۔ جو کچھ میں نے پوچھا ہے وہ کہنا ہی پڑے گا۔

امراؤ : کیا زبردستی ہے۔ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔

رسوا : بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔

امراؤ : آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں، وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔ واقعی مرزا صاحب شہر یا دیہات یہ رسم تو کچھ اچھی نہیں۔

رسوا : آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور کانوں سے سنا ہے۔ اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پٹی جارہی ہیں اور یہ خوش ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا! اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں اس کا ذکر بھی کیا۔ خیر ان باتوں کو رہنے دیجئے اپنی بیتی کہئے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔

امراؤ : آپ نہ مانیئے گا۔ لے سنئے :

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بے باکی کی سند حاصل ہوگئی۔ آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہوگئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سج دئے گئے تھے۔ نواڑ

کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ فرش پر ستھری چاندنی کھچی ہوئی۔ بڑے بڑے نقشی پان دان، حسن دان، خاص دان، اگال دان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلی آئینے، عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ۔ ادھر ادھر عمدہ ہانڈیاں۔ سرِ شام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ خوب صورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی گڑگڑی منھ سے لگی ہوئی ہے، سامنے پان دان کھلا ہوا ہے، ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں، چہلیں ہوتی جاتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں کرتیں۔ جو ہے انہی کے حکم کا تابع ہے۔ حکومت بھی وہ کہ زمین و آسمان ٹل جائے مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا بن مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دیئے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان دے دے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں۔ ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجہ میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں۔ لوگ منا رہے ہیں، کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے، کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے، یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا، ادھر سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں، اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں، اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں، وہ بھی ہیچ یہ بھی ہیچ، ہے فقط بناوٹ۔ اگر وہ بیچارہ اس فریب میں

آگیا پھر کیا تھا پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔

آج کل ان کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں ان کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی۔ اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں مگر یہ کرشمہ دیکھ دیکھ کے جو کچھ میرے دل پر گذرتی تھی اس کو میں خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ، اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے بھی مجھی پر مریں، نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں نہ کسی پر جان دیں، مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جس کی در و دیوار سے لے کر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی، اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا ہوا تھا، اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑ رہتے تھے۔ ایک طرف کوٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا، اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے، یہیں دو بد قلعی سی پتیلیاں، لگن، توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی تھی، اس پر دو تین دالیں، نمک مصالحہ ہانڈیوں میں۔ اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختے، مصالحہ پیسنے کی سل بٹہ۔ خلاصہ یہ کہ تمام کر کری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کیلیں لگی تھیں۔ کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا اور چکنا ہوا چھوٹا سا ڈیوٹ پلنگ کے پاس دھرا رہتا تھا۔ کھانا پکانے کے بعد ہی وہ چراغ اس پر رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت سی بتی پڑی ہے۔ موا اندھا اندھا جل رہا ہے، لاکھ اکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن دال کی پتیلی۔ چپاتیاں مولوی صاحب،

کے واسطے ڈھانپ کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز ڈالا چھینکا چولہے کے قریب تھا اور یہ دوسرا میرے سینے پر تھا جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے سینے پر دھرا رہتا تھا۔ اگر پلنگ پر اچانک کھڑی ہوئی تو سالن کی پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔

صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے ۹ بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور گھونسوں سے مار۔ یہ ہمارا اخلاص پیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اوّل اوّل تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے ان کی پٹاری سے آئینہ نکالا۔ اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی، اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا: تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب بھی سینکڑوں سے اچھی ہو۔ اس وقت تو اور بھی جوبن ہوگا۔

امراؤ: تسلیم۔ خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجئے۔ بالکل بے محل اور بے موقع ہے۔ معاف کیجئے گا، مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال تھا اور یہ خیال میری جان کے لئے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی، ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔

رسوا: یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی مگر بات یہ ہے کہ آپ کی مسی نہیں ہوئی تھی، خانم سے لوگ ڈرتے تھے اس لئے آپ سے کوئی بولتا نہ ہوگا۔

امراؤ: شاید یہی ہو مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی "بے دولتی اپنے تیہے میں آپ کھولتی"۔ اپنی ہم جولیوں کو دیکھ دیکھ کے پھکی جاتی تھی۔ کھانا پینا حرام،

راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔

اسی زمانے میں پھر کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا، اس لئے کہ کوئی چوٹی کا گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا، وہی بوا حسینی۔ وہ بھی جب انھیں فرصت ہوئی، نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں، سر جھاڑ منہ پھاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا اور سب رنڈیاں تو دن بھر میں تین تین جوڑے بدلتی تھیں یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ کارچوبی جوڑے بدلتے تھے، یہاں وہی گل بدن کا پائجامہ، ململ کا دوپٹہ۔ بڑی بڑائی ہوئی لچکہ کی تیلی دے دی گئی۔

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں۔ کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی، کبھی امیر جان کے پاس۔ مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزے داریوں کا خیال تھا، مجھے کون بیٹھنے دیتا۔

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا، کسی کا منہ چڑھا دیا۔ کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں مجھے کس قدر غنیمت معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کہیں دو نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں، مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوا سوہن کی ٹکیاں لیتا آیا، مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں

معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا، وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے میں نے اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کے پانے کی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے مگر روپیہ کبھی نہ ملا تھا۔ وہ روپیہ بہت دن تک میں نے جگو رکھا اس لئے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت مجھے نہ تھی، اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے کہاں سے ملا تو کیا بتاؤں گی۔ رازداری کی سمجھ مجھے بھی آگئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز کو پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

۵

ایک شاطر چور دل میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کمبخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر برس رہا ہے، بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آ رہی ہے کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گذر رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری گھگھی بندھ گئی، منہ سے آواز تک نہ نکلی، اور آخر کار میں بیہوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی۔ وہ کہاں سے ملتا ہے۔ خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے، مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا : یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہوتا تو کیوں بتاؤں ؟

امراؤ : خیر اب حاشیے نہ چڑھائیے سنے جائیے۔

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اداس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

رسوا : کیوں نہ ہنسی آئے ، ان کی تو ساری امیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔

امراؤ : امیدیں خاک میں مل گئیں ! خانم کو آپ نہیں جانتے ، ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس معاملہ کو اس طرح دبا دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور التیام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک ہد ہد پھنس گیا۔

ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحبزادے طالب علمی کے لئے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش۔ والد مرحوم ان کے رشوت نذرانہ کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف کے لئے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی علم تماش بینی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف راشد علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب لکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ کا لقب دیا مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی۔ آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے ، اس لئے تھوڑی ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر آئے تھے تو خاصی ڈاڑھی منہ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی پہلے کتروان ہوئی ، پھر خشخاشی،

اور تھوڑے دنوں کے بعد تو بالکل صفایا ہو گیا۔

ڈاڑھی منڈنے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا۔ مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بھدی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گال پچکے ہوئے، تنگ پیشانی، کوتاہ گردن، ٹھنگنا سا قد، غرض کہ بہ ہمہ صفت موصوف تھے، مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے تھے۔ پہر دن آئینہ سامنے رہتا تھا۔ مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہو گئی۔ بال بڑھائے گئے، گھونگھر بنایا گیا۔ نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی۔ اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا۔ بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی دربار داری کے لئے کیا گیا تھا۔

اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہو گئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہوتا ہے۔ بگن چپتیں لگاتی تھیں۔ حسنا نے جوتا کھینچ مارا، آپ ہیں کہ ٹھی ٹھی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے۔ جس رنڈی سے ایک شب کے لئے بھی واسطہ ہو گیا اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک کر کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا تھا کہ آپ یہاں مشرب ہو چکے ہیں۔

سر شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے، ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے۔ خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتاتے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھا وہ تھا، منہ سے طبلہ خوب بجاتے تھے۔ یاروں نے خوب بنا لیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کی کہ آپ کو فخر آتش و ناسخ بنا دیا۔ مشاعروں میں ڈریائے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی تمام مشاعرہ چونک گیا۔ ریختی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔

ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے، آپ خوش ہوتے تھے، جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے غل و غش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے مولوی بن کے آئے گا یہ جو کچھ لکھ بھیجتے تھے، بھیج دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے بے فکرے، خوش پوشاک، عیش پسند، مفت خورے، آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انھیں لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب! ابھی وہ کمسن ہے"۔ اور ان کی التجا منت وزاری۔ بے قراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوا دوش سے پانچ ہزار روپے پر توڑ ہوا۔ اس روپیہ کے لینے کے لئے آپ کو چند روز کے لئے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیئے۔ بیس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے۔ پانچ توڑے گن دیئے۔

روپیہ عین المال دیوان جی کی معرفت خانم کے خزانۂ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے۔ پانچ سو روپیہ نذر نیاز کے نام سے لے مریں۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینہ تک آپ لکھنؤ میں رہے۔ سو روپیہ ماہوار دیتے تھے، فرمائش کا ذکر نہیں۔ جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا، خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں دو خدمت گار میرے لئے خاص ملازم ہوئے۔ پھاٹک کے پاس والا کمرہ میرے رہنے کے لئے سج دیا گیا۔ دو چار مرد آدمی، شریف زادے، نواب زادے میرے پاس بھی آ کر بیٹھنے لگے۔

گل چین اول گوہر مرزا ہر زمانے میں مجھ سے برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی اس لئے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا، جو آمدنی وہاں سے تھی وہ بند ہو گئی۔ بنو ڑھیا ہو چکی تھیں، کوئی

پوچھتا نہ تھا۔ اس لئے گوہر مرزا کے صرف کی خبر گیری میرے ذمہ تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنائے رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھی سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں، صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں سے تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ جرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمہ لے کے مجرے میں انہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں۔ ہر سم پر آہ کہتے ہیں، ہر تال پر واہ کر رہے ہیں۔ وہ بھاؤ بتا رہی ہے، یہ شرح کرتے جاتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا ہے۔ خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی، انہی کی بدولت ان کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے۔ ادھر وہ چاہتے ہیں کہ رنڈی ان کو چاہنے لگے، ادھر رنڈی جان جان کے ان کا کلمہ بھر رہی ہے۔ کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں، نہیں معلوم آپ سے کیوں کر ملتی ہوں۔ اب ان کے آنے کا وقت ہے، مجھے جانے دیجئے۔ وہ تو ہمیشہ کے ہیں۔ آپ اس طرح کیا نباہئے گا۔"

تماشبین ان سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد۔ شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات۔ بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماشبین ایک طرف خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے رنڈی ان کو پیار کرتی ہے کہیں ایسا نہ ہو ان کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ پرسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ

پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دئے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کر لے گیا۔ ایک دن جھالے کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑ کی دے دی اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کانوں سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی روٹیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا، طبیعت میں سفلہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا، خانم صاحب پچاس پچپن برس کے سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ صورت دار جوان تھے، کسرتی بدن تھا۔ اچھے اچھوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا۔ کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے، نانِ شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کر دی مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا۔ دن رات یہیں رہتے تھے، گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب کوئی ستر برس کا سن، کمر جھکی ہوئی، نہ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے، اب ان سے کوئی واسطہ نہ تھا، مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے۔ کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ افیم، گنا، ریوڑیاں ان سب اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ خورشید جان غم زدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔

کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے ان پر غم سوار ہے۔ خ... براہ فہمائش کہا "جاؤ چھو کر دو" نہیں معلوم اس زمانے کی محبتیں کس قسم کی ہیں۔ ... رنڈیاں ویسے ان کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشا... کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں۔ جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی، ماں باپوں نے شادی ٹھہرائی، آپ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے، میں نے مانجھے کے

جوڑے کے پرزے پرزے کر دئے۔ ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گذرا، آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو ہے کوئی ایسا تمھارا بھی؟ سب نے سر جھکا لیا۔

۶

یوں تو بسم اللہ کی مسی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی۔ مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں کے لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند تکیے، سامنے رنگ رنگ کے مردنگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں کی خوشبو، گلوریوں کی مہک سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا تھا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانوں کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زباں تھیں۔ گلا وہ کہ چار محلے ادھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب واقعی کیا رنگ دیکھتی تھیں، ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کیا کرتی تھیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ جمے گا؟

پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں کچھ محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی، صورت اچھی نہ تھی، مگر اس وقت کی پھرتی چالاکی الھڑ پن؟

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کیا عجب زمانہ تھا

گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرادی :

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کردی۔

پھر نظر چھپتی ہے اور آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر کا یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے

ذرا اس شعر کو سنئے اور قیاس کیجئے۔ عاشق مزاجوں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص محظوظ تھا۔ ہر لفظ پر واہ، ہر سم پر اہاہا۔ ایک ایک شعر آٹھ دس مرتبہ گوایا گیا، پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اسی غزل پر

میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی گوائی گئی۔

مرزا رسوا : وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہو از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کس کی غزل ہے ؟

امراؤ : اوئی۔ کیا آپ نہیں جانتے ؟

رسوا : میں سمجھا۔

امراؤ : اور شعر سنئے :

تا لب گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ کبھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

رسوا : سبحان اللہ۔

امراؤ : واقعی قلم توڑ دیا ہے۔

آہ میں کچھ کبھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ کبھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا : یہ فلسفہ ہے اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ : اور سنئے :

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج ہوا ہوتا ہے

رسوا : یہ بھی فلسفہ ہے اسے وہی خوب سمجھتے ہیں۔

امراؤ : اور سنئے :

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا : یہ تصوف ہے۔ ہم دنیا کے لوگ ہیں ، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں مگر

"شوق اظہار"، یہ لفظیں کیوں کر بل جایا کرتی ہیں۔

امراؤ : مقطع سنئے :

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ.....

ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

رسوا : مطلع سے مقطع نکالا ہے۔ مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی۔

امراؤ : فرصت انھیں کب ملتی ہے۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں ایک خدمت گار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی : دیکھو امراؤ صاحب یہ کیا کہتا ہے۔ اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے کے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار : (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے جو کل شب کو محفل میں زرد مندیل سر پر رکھے دولھا کے داہنی طرف بیٹھے تھے، اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو، اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں : نواب صاحب سے میری تسلیمات کہنا اور کہنا شام کو جب چاہئے تشریف لائیے۔ تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لئے کل دن کو کسی وقت آنا، لکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا، میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی، غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی، اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال کے مجھے دی اور کہا کہ نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لایق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لئے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے

یہ اشرفیاں دے دوں وہ خانم کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ اشرفیوں کی طرف جو دیکھا چمکتی چمکتی نئے گھن کی اشرفیاں، بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں، اس وقت صندوقچہ وندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا، پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیں۔

۷

مرزا رسوا صاحب ! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے ۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا ، مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈھتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں شامل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین چھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپیہ کے سوا جس کو میں کہہ چکی ہوں کبھی نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈھتا تھا جو میری ناز برداری کرے ، روپیہ خرچے، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے ۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی تھی۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے ، بے شک پسند ہے ، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گھنا تاکتے ہوئے آتے ہیں ، جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو ، خدا کے لئے چاہو ، چاہو اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ کہ تمھارے

پاس ہے ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ماماگیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ، ہمارے اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتے ہیں، مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک طرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہیئے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہوگیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا۔ صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن، بھولے بھالے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں تھے۔ دنیا کے جعل فریب سے آگاہ نہ تھے۔ اظہار تو عشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی، مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنا لیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں، بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا کچھ جھوٹ۔ سچ تو اس لئے کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت بتیسی، گھونگھر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی، چوڑی کلائیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھولی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں اکثر انہی کی تصنیف، شعر پڑھنے

میں ہوا ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔

شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھیپ نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے اور بزرگ خورد کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرض کہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت رہی۔

نواب : آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا کہ بغیر آپ کے دیکھے مجھے چین ہی نہیں آتا۔

میں : یہ سب آپ کی قدردانی ہے ورنہ من کیا اور میری حقیقت کیا "ایاز قدر خود بہ شناس من آنم کہ من دانم"۔

نواب : ادہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں!

میں : جی ہاں، کچھ شُد بُد پڑھا تو ہے۔

نواب : اور لکھنا بھی جانتی ہو؟

میں : جی ہاں، لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب : تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے؟

(میں مسکرا کے چپ ہو رہی)

نواب : واللہ کتنا پیارا خط ہے۔ اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا، خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا۔ اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے۔ جہاں تک ہو سکے ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

نہ غیروں کی وساطت ہو نہ یاروں کی شماتت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں رازداروں کے ہمیں تم ہو

میں : یہ آپ ہی کا شعر ہے ؟

نواب : جی نہیں ، والد مرحوم نے فرمایا تھا۔

میں : کیا خوب فرمایا ہے۔

نواب : ماشاء اللہ! آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسن تقریر بھی ہو خوبیٔ تحریر بھی ہو

میں : کس کا شعر ہے ؟

نواب : انہی کا۔

میں : کیا خوب فرمایا ہے۔

نواب : جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں : یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب : واہ کیا صاف صاف شعر ہے۔

میں : تسلیم

نواب : یہ کہئے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

میں : جی نہیں آپ ایسے قدردانوں سے کہوا لیتی ہوں۔

اس بات پر پہلے تو نواب صاحب اک ذرا چیں بجبیں ہوئے پھر مجھے مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔

نواب : خوب کہی۔ جی ہاں اکثر رنڈیوں کا یہ وطیرہ ہے کہ یاروں سے کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔

میں : آپ رنڈیوں کو ایسا نہ کہئے کیا مرد ایسا نہیں کرتے ؟

نواب : واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنھوں نے کبھی ایک مصرعہ نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے چھانٹ دئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی۔

میں : خدا جانے! یہ بھی ایک ہوس ہے اور بری ہوس۔

نواب : اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہے تو پڑھئے۔

میں : فرض ہے ضبط نالہ و فریاد!
جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب : کیا شعر پڑھا ہے پھر پڑھئے گا۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے۔

میں : (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم۔ آپ قدردانی کرتے ہیں۔

نواب : شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھئے۔

میں : اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔

نواب : یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر۔ اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھئے۔

میں : اب آپ ارشاد کیجئے۔ اسی لئے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب : میں پڑھے دیتا ہوں، مگر آپ کو غزل پڑھنا ہوگی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ رنگت، بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب جنا

سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہوگا، کمرے میں کوئی نہ ہوگا۔ کس مزے کی گفتگو، کیا ستھرا مذاق تھا، کیا راز و نیاز ہو رہا تھا، کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی۔ اس کمبخت نے کیسا مزے میں خلل ڈالا۔ نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے اس کے بعد میں کچھ کہتی۔ نواب تعریفیں کرتے۔ کیا دل خوش ہوتا۔ آج ہی تو ایسا ایک قدردان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈتا تھا اور آج ہی اس آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اڑائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خون خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کی طرف دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خاں ہوگیا۔ مجھے بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا میرے کلیجے کے پار ہوگی یا خدا نخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوستی تھی۔ خدا غارت کرے موا کہاں سے اس وقت آگیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا بوا حسینی کو آواز دی۔ انھوں نے آکے یہ ماجرا دیکھا۔ سمجھ گئیں۔ بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی : خاں صاحب ! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے۔ ادھر تشریف لائیے۔

خاں صاحب : جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے ہیں۔

بوا حسینی : تو خاں صاحب ! کوئی زبردستی ہے۔

خاں صاحب : اس میں زبردستی کیا۔ رنڈیوں کے مکان پر کسی ..... کا اجارہ نہیں اور اگر زبردستی ہی سہی۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے۔ دیکھیں تو ہمیں کون ..... اٹھا دیتا ہے۔

بوا حسینی : اجارہ کیوں نہیں۔ جو زر خرچے گا رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آسکتا۔

خاں صاحب : تو زر خرچنے کو ہم نابر ہیں۔

بواحسینی : اچھا اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں اور کسی وقت تشریف لائیے گا۔

خاں صاحب : عورت کچھ واہی ہوئی ہے، کہہ دیا ہم نہیں اٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ مگر ابھی تک چپکے بیٹھے رہے۔ کچھ منہ سے نہیں بولتے۔

بواحسینی : بیٹی! اچھا تو اٹھ کے ادھر چلی آ۔ نواب صاحب آپ کے آرام کا وقت ہے کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑ مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں۔

نواب : خاں صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ اسی میں خیریت ہے۔ آپ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر تھتک کرنا اچھا نہیں۔ مگر آپ .....

خاں صاحب : مگر اب تم کیا کر سکتے ہو دیکھیں تو کون ..... رنڈی کا ہاتھ چھڑا لیتا ہے۔

میں : (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجئے میں کہیں جاتی نہیں (واقعی میں نواب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)۔

(خاں صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا)

نواب : میں کہے دیتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔

خاں صاحب : خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے جو کچھ ہو سکے کر لو۔

نواب : یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں، مگر رنڈی کا مکان کوئی اکھاڑہ نہیں ہے نہ میدان۔ بہتر ہے کہ اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھئے اور اب تشریف لے جائیے نہیں

تو .....

خاں صاحب : نہیں تو تم مجھے گھول کے پی جاؤ گے۔ تشریف لے جائیے، یہ ایک ہی کہی۔ تم ہی نہیں چلے جاتے۔

نواب : خاں صاحب! جناب امیر کی قسم میں بہت طرح دیتا ہوں اس لئے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین، عزیز، دوست جو سنے گا نام رکھے گا ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ حجت نہ کیجئے تشریف لے جائیے۔

خاں صاحب : رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو۔ گستاخیاں کیسی تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بھی بیٹھے ہو ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا جائیں گے۔ تم خود بے کار حجت کرتے ہو کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب : اٹھا دینا کوئی مشکل نہیں۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ابھی ہاتھ دے کے نکال دیتے ہیں۔

خاں صاحب : خدمت گاروں کے بل پر نہ پھولنا۔ یہ کٹار کبھی دیکھا ہے۔

نواب : ایسے بہت کٹار دیکھے، جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے۔ آپ کی کٹار میان سے نکلتی رہے گی۔ یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خاں صاحب : لے اب تم ہی گھر کو چلے جاؤ اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے، مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے ہیں، مگر داد ری شرافت اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا، مگر یہ آپ ہی کی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے مگر یہ خیال میرا غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا۔ اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے

تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے مگر اس پاجی کی بدزبانی بڑھتی جاتی تھی جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ ادر شیر ہوتا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا:

نواب : اچھا اٹھیے خاں صاحب! ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں۔ عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

خاں صاحب : (قہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ۔ کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب : مردود! اب تیری بدزبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی کہتے نواب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طپنچہ تھا، دن سے داغ دیا۔ خاں صاحب دھم سے گر پڑے۔ میں سن سے ہو گئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طپنچہ کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہریاں، تو، میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کے نواب کے ہاتھ سے طپنچہ لیا اور کہا "لے حضور اب گھر تشریف لے جائیں۔ میں سمجھ لوں گا۔"

نواب : میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا ہوا۔ اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

شمشیر خاں : (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجے میں مار لوں گا۔ نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیے۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا، خاں صاحب کے گولی کہاں لگی ہے۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے، بازو میں گولی لگی تھی۔

شمشیر خاں : میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کو ہوا ہی کیا ہے، آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ گھر تشریف لے گئے۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا، وہ چوک ہی میں تھے فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جاکر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا۔ وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے:

مرزا : ہوگا پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے۔ سمجھ لیا جائے گا۔

خیر! خاں صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا گیا۔ بازو پر پٹی باندھی ڈولی بلوائی گئی۔ خاں صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آگیا تھا۔ مکان کا پتہ پوچھا معلوم ہوا مرغ خانہ میں رہتے ہیں۔ ڈولی پر بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا مکان کے قریب کہیں اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہوگئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا تھا بھی۔ وضعدار آدمی تھے۔ پہلے ہی جب وہ آئے تھے آدمی کی زبانی بیشتر بہت تاکید تخلیے کے لئے کردی تھی [illegible] نے اقرار کرلیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا، مگر اتنی چوک ہوگئی کہ درواز[illegible] دیا۔ خاں صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے۔ سارا کھیل بگ[illegible] سے پانچ چار دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آگیا تھا۔ وہاں سلطان صاحب تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہوا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا، اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا کوئی نو برس کا سن بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا تھا۔ علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلایا، پاس بٹھایا، ایک

پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں : سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا : کون سلطان صاحب؟

میں : وہ جو دولہا کے برابر تمہارے پاس بیٹھے تھے۔

لڑکا : (تیوری چڑھا کے) واہ وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ انھیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں : اچھا تو ہم کچھ دیں انھیں دے دوگے؟

لڑکا : کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں۔

میں : خفا نہیں ہوں گے۔

لڑکا : اور دوگی کیا پان؟

میں : پان نہیں۔ پان تو ان کے خاصدان میں ہوں گے۔ اے لو۔ یہ کاغذ دے دینا۔ ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب
بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہئے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا۔ ان کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کی پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا۔ پڑھا تو پہلے چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے، پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے، اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔

شمشیر خاں کو اشارے سے بلایا۔ اس کے کان میں کچھ چپکے سے کہا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خان ہمارے پاس کمرے میں آیا۔

شمشیر خاں : نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں

گے۔

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا۔ اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے سونی معلوم ہوتی تھی۔ گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں توں مجرا ختم ہوا۔ میں گھر پر آئی۔ اس دن، دن بھر شمشیر خاں کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد آیا۔ نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا:

"تمھارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی کرید کر بھڑکا دیا۔ واقعی مجھے تم سے محبت ہے، مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمھارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں، کل میں تمھیں وہاں بلوا بھیجوں گا۔ بشرط فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے وہ بھی نو دس بجے رات تک

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لائے ہیں"۔

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتہ میں دو تین مرتبہ نواز گنج میں نواب بنّے صاحب کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا، کبھی نواب بنّے صاحب طبلہ بجانے لگے، میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود کبھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو کچھ ایسے واقف نہ تھے مگر [illegible] گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے اس جلسہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن، شب مہتاب کا عالم، صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکیئے لگے ہوئے، سامان عیش و نشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، بیلے

چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبودار گلوریاں، بسے ہوئے حقے، تخلئے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں۔ ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے، اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی سبب سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں شعر پڑھتے تھے، میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا: اچھا وہ سب کچھ تو ہوا آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراؤ: واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے ہیں؟ یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا: یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں صفائی ہو گئی۔

امراؤ: آپ جو چاہے کہئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز نہ

بیان کرتی ۔خیر! اب قصور ہوا۔

رسوا: قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا ہے، جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ جائے گا، خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ، اس کا میں ذمہ نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔

امراؤ: آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا: خیر! بگاڑنا نہیں۔ اچھا اب شعر پڑھئے۔

امراؤ: اچھا سنئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرصت سے بہت بیتابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریک ـــــ بزم ماتم ہو گئیں
ہم نشیں دیکھی نحوست داستان ہجر کی
صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

۸

اسی زمانہ میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا، منھ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہوگئی تھی، سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا۔ مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کا کپھلی کا انگرکھا اور گل بدن کا پائجامہ، لال نیفہ، مصالحہ دار ٹوپی، کاکالین پٹی ہوئی عمر بھر نہ بھولیں گے۔

آپ کہئے گا اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا؟ سنئے! مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر، رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان وشوکت کے تھے وہاں سلامتی منانے کے لئے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم۔ پچھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لئے مفاجت کرکے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئے نواب بوڑھے ہوگئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانہ میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی کھلائی آکے زبردستی اٹھالے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں، ان سے اچھی طرح ڈرتے تھے، جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرۂ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

آپ تو ہنستے ہوں گے مگر میرے دل سے پوچھئے، بے شک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔

فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سیکڑوں سوز یاد ہو گئے۔ دور دور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں پٹکے، شیشہ آلات، جو شے تھی نادر تھی۔ عشرۂ محرم میں دس روز تک مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خوان میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔

مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو امام باڑہ میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی، نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گذرے ہوئے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی۔ انھوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دے رکھا تھا، صاف انکار کر دیا، مگر انکار چلتا کب تھا۔ شاہی زمانہ، ان کی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی، وہ کب مانتے تھے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے، مصاحبین جمع ہیں، بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہوں۔ نواب صاحب طنبورہ چھیڑ رہے ہیں۔

نواب کے ایک مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبر دار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سب کو بھی یہی خیال تھا مگر وہ درانہ دیوان خانے میں گھسے چلے آئے، آکے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا۔ نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب : خیر اب تعظیم و تکریم کو رہنے دیجئے۔ مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا ہے ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔

نواب : ارشاد۔

بڑے نواب : آپ بچے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی نواب احمد علی خاں مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا، اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں، کوئی حق آپ کا اس جائداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض اور متصرف ہیں۔ بے شک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں، مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائداد بنا بر اس وصیت نامہ کے آپ کو مل سکتی ہے۔ لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں اور زیادہ کی آپ سے باز پرس نہ کی جائے گی، اس لئے کہ آپ میرے خون و جگر ہیں (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے مگر پھر ضبط کر کے) آپ اس جائداد پر مدت العمر قابض و متصرف رہتے، میری ذاتی جائداد میرے خرچ کے لئے کفالت کرتی ہے اور اس جائداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے مگر آپ کی بد وضعی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لئے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہمراہ ہیں۔ اس وقت تمام گھر کا تعلیقہ ہوگا۔

آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جائیے۔

نواب : تو اس جائداد میں میرا کوئی حق نہیں ؟

بڑے نواب : جی نہیں۔

نواب : اچھا ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں۔

بڑے نواب : وہ آپ لے چکے اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف لے چلئے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبہ نہیں۔

نواب : تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب : وہ آپ سے دستبردار ہوتی ہیں، وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔

نواب : تو اچھا میں کہاں جاؤں ؟

بڑے نواب : یہ میں کیا جانوں۔ یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین اور معشوقہ سے دریافت کیجئے۔

نواب : اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔

بڑے نواب : اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے، نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں چلے آئے۔ نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ پر کیں، چوک کا راستہ لیا۔ مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستہ ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بے کار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا راستہ میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا۔ ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب، دوست، جان نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے۔ مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت واحدے دبے مزاحمتے غیرے قابض و متصرف ہیں، نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو: دیکھو بسم اللہ جان! نواب سے تو اب کوئی امید نہ رکھو، میں جو کچھ کہو وہ دیے دیا کروں۔ غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں۔ مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ: غریب آدمی ہو، یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نو من چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو: ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو، وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ: آپ کی والدہ صاحبہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نہ؟

میر حسنو: (جھیپ کر) وہ جو کوئی ہوں، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور چھوڑ کے مری ہیں۔

بسم اللہ: وہ آپ کی بیوی لے یار کے ساتھ نکل گئیں۔ آپ کے پلے کیا پڑا۔ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریئے مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو: تو کیا والد کے پاس کچھ کم تھا۔

بسم اللہ: والد آپ کے نواب حسن علی خاں کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو : چڑی ماروں میں ؟

بسم اللہ : اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو : مرغ بازوں میں تھے ؟

بسم اللہ : اچھا وہ بٹیر باز سہی۔ تھا تو چڑی مار کا کام۔

حسنو : لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ : میں کھری کہتی ہوں ، اسی سے بری مشہور ہوں ، اور کہتی بھی نہ ، تمہارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تم آتے تھے میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات گذری آج ہی آپ نے میرے منھ در منھ نوکری کا پیغام دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھوگے ، یہی نہ ایک مہینہ دو مہینہ ، تین مہینے سہی۔

حسنو : چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں ؟

بسم اللہ : زبان سے۔

حسنو : یہ لو۔ (سونے کے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) ۔ تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا ؟

بسم اللہ : میں دیکھوں (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لئے) کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی ، مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا آپ تشریف لے جائیے۔ اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ، ٹھہر نہیں سکتی۔ کل اسی وقت آئیے گا۔

حسنو : تو کڑے اتار دیجئے۔

بسم اللہ : یا اللہ ! کوئی چوروں سے بھوار ہے۔ میں تمہارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پٹریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں۔ ان سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کر دگی۔ اس لئے ذرا ہاتھ میں ڈال لئے ، صبح لے جانا۔

حسنو : کڑے دے دیجئے۔ میرے نہیں ہیں ، نہیں تو کیا بات تھی ، تم پر سے صدقے

کئے تھے۔

بسم اللہ : تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔ انھوں نے انتقال کیا، پھر بھی آپ کا مال نہیں۔

حسنو : میں نے یوں ہی تمھیں دکھائے تھے، میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ : جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کپڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی کو دئے تھے۔

حسنو : لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ : یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ میں پورے سو لوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا، میرے سامنے صندوقچہ سے نکال کے کپڑے پھینک دئے تھے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراؤ یہ وہی کپڑے ہیں نہ؟

میں : مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ : لے خشکا کھائیے۔ اب یہ کپڑے آپ کو نہ دئے جائیں گے۔ نواب کے کپڑے ہیں ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو : لو اچھی کہی۔ اور وہ روپے جو ہم نے دئے ہیں۔

بسم اللہ : روپے تم کہاں سے لائے، وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو : جی سچ۔ مہاجن سے بیاز (سودی) نہ لاکے دئے تھے۔

بسم اللہ : اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے، ہم اس کو روپے دے دیں گے۔ آپ ٹہلئے۔

حسنو! کپڑے تو میں لے جاؤں گا۔

بسم اللہ : میں تو نہ دوں گی۔

حسنو : تو کچھ زبردستی ہے؟

بسم اللہ : جی ہاں زبردستی ہے لے اب چپکے سے کھسک جایئے نہیں تو.....

حسنو : اچھا تو رہنے دیجئے کل ہی دے دیجئے گا۔

بسم اللہ : کل دیکھا جائے گا۔

"دیکھا جائے گا" بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جانا ہی پڑا۔

بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا نے چھبن صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے۔ اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت تھا اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔ حسنو سے جب اس کڑے کی جوڑی کے لئے باز پرس ہوئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔

اسی سے میاں حسنو کی کور دبی تھی۔

بسم اللہ : (حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا بہن یہ بڑا قابو چی ہے۔ نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا۔ میں مدت سے اس موے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دیتی ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے۔ چوری کا تو مال ہے۔

میں : ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو احسان ہوگا۔

بسم اللہ : نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے۔ موئے نے سوا دو سو روپے پر ہتھیالی تھی۔ زیادہ برس نیمت۔ سوا دو سو حوالے کروں گی۔ دس بیس سود کے سہی۔

میں : بھلا مہاجن یوں کیوں دینے لگا۔

بسم اللہ : مہاجن ! اسی نے روپے دیئے تھے اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹرپھس کرے گے تو ان کو کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پا پیادہ اکیلے۔

چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، نہ وہ شان، نہ وہ شوکت، نہ وہ رعب وداب، نہ وہ بے تکلفی چپکے سے آکے بیٹھ رہے۔

سچ کہوں میری تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ: نواب دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی۔

نواب: وہی ہیں۔ وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی نہیں ہوئے۔

بسم اللہ: کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب: یہ تو یاد نہیں شاید ڈھائی سو یا سوا دو سو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ: اور سود کیا تھا؟

نواب: سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گروی ہوئی پھر اس کے چھڑانے کی نوبت کبھی نہیں آئی جو سود کا حساب کیا جاتا۔

بسم اللہ: اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب: لے لو۔

بسم اللہ: کہو تو میاں حسنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب: نہیں، میرے سر کی قسم ایسا نہ کرنا 'سید' ہے۔

بسم اللہ: سید ہے؟ اس کے باپ کا تو پتہ نہیں۔

نواب: خیر، وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت کیا کہنا خاندانی رئیس ہیں نہ۔

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے۔ نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کرکے

ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔ اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی۔ خانم صاحب کو جھک جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم : کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا : کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں کیوں ؟

خانم : بوا یہاں کون ہے ؟ میں ہوں تم ہو اور یہ چھوکری، اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔

بڑھیا : مجھے نواب فخر النسا بیگم نے بھیجا ہے۔

خانم : کون فخر النسا بیگم صاحبہ ؟

بڑھیا : اے تو تم نہیں جانتیں، نواب چھبن صاحب .....

خانم : سمجھی کہو۔

بڑھیا : بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی اماں ہیں نا ؟

خانم : ہاں، بات کہو۔

بڑھیا : بیگم صاحب نے کہا ہے کہ "چھبن صاحب میرا اکلوتا لڑکا ہے۔ میں بھی اس پر پروانہ ہوں اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے۔ اپنی اولاد سے بڑھ کے سمجھتا ہے۔ اس کی بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے، چھبن کی منگیتر۔ لڑکی پرگالی پڑھ چکی ہے۔ چھبن نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ سب تنبیہ کے لئے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے۔ جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور کون ہے۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی

بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔"

خانم : بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے خدا چاہے تو وہی ہوگا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں۔ مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہوگا، خاطر جمع رکھئے۔

بڑھیا : مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔ بڑا ضدی لڑکا ہے اگر کہیں معلوم ہوگا تو ہرگز نہ مانے گا۔"

خانم : (ماما سے) کیا مجال (مجھ سے) دیکھ چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔

میں : جی نہیں۔

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم : میری طرف سے عرض کرنا اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دو انچھر کان میں پھونک دئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں۔ بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی موجود ہوں کہ اتنے میں خانم صاحب بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر جا کے کھڑی ہوئیں۔

خانم : اے لوگوں! ہم بھی آ دیں؟

بسم اللہ : (نواب سے) ذرا سرک بیٹھو اماں آتی ہیں۔ (خانم سے) آئیے۔

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم

کو اس طرح مؤدب ہو کر سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم : (نواب سے) حضور کا مزاج کیسا ہے۔

نواب : (گردن جھکا کے) الحمد للہ۔

خانم : خدا خوش رکھے، ہم لوگ تو دعا گو ہیں ہزار بڑھ جائیں، مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مال زادی۔ آپ کے ہاتھ کے دیکھنے والے۔

آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے، اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں۔ یوں تو بسم اللہ خدا رکھے سال بھر سے آپ کی خدمت میں ہے مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی، بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں، بسم اللہ ان کا منہ دیکھ رہی ہیں کہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھے ہوئے تھی۔ نواب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھپی جاتی ہیں مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم : تو پھر عرض کروں؟

نواب : (بہت ہی مشکل سے) کہیے۔

خانم : (مجھ سے) ذرا بوا حسینی کو بلا لینا۔

میں گئی اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم : (بوا حسینی سے) بوا ذرا دوشالے کی جوڑی تو اٹھا لانا۔ وہی جو کل بکنے کو آگئی ہے۔

'بکنے کو آئی ہے' ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا جیسے کسی پر دفعتاً بجلی گرے، مگر بہت ضبط کر کے چپکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دوشالے لے آئیں۔ کیسا پر متن زرگار دوشالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

خانم : (نواب کو دوشالہ دکھا کے) دیکھئے یہ دوشالہ کل بکنے آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار

کہتا ہے۔ پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دئے ہیں وہ نہیں دیتا۔ میری نگاہ میں سترہ بلکہ اٹھارہ تک مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک دوشالہ تو اور اوڑھ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے نواب سے کہا:

خانم : ٹھہر لڑکی تو ہمارے بیچ میں نہ بولنا۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے۔ ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔

نواب پھر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم : اوئی نواب! سنی سے سوم بھلا جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجئے۔ سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی نہیں سہی کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم : اللہ حضور! جواب دیجئے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے، موئی بازاری کسبی۔ مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھوکریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجئے۔

نواب : (آبدیدہ ہوکر) خانم صاحب! اس دوشالے کی کوئی اصل نہیں ہے، مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا اور امراؤ جان بھی تو اس دن تھیں۔

خانم : مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں؟ خیر تو ہے؟

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے آنکھ کا اشارہ کیا وہ چپ رہیں۔ ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی بیٹھی تھی۔

نواب : اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کر سکیں۔

خانم : آپ کے دشمن اس قابل نہ رہے ہوں اور میں ایسی چھچھوری نہیں جو روز

فرمائشیں کیا کروں۔ فرمائشیں کریں نہ کریں بسم اللہ کریں بھلا میں بوڑھی آڑھی میری فرمائشیں کیا اور میں کیا۔

یہ کہہ کے خانم نے ایک آہ سرد بھری۔ ہائے تقدیر اب ہم اس لایق ہو گئے کہ ایسے ایسے رئیس ایک ذرا سے چھیتھڑے کے لئے ہم سے منھ چھپاتے ہیں۔

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب : خانم صاحب آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اب میں اس لائق نہیں رہا جو کسی کی فرمائش پوری کروں۔

اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم : خیر میاں ! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں۔ پھر تو لونڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا۔ حضور کو نہیں معلوم کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہیں۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو ؟ ہم لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا۔ یوں آئیے ، آپ کا گھر ہے ، میں منع نہیں کرتی ، مگر آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہئے۔

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرے سے چلی گئیں۔

نواب : واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی اب انشاء اللہ نہ آؤں گا۔

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ کے بٹھا لیا۔

بسم اللہ : اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو ؟

نواب : (کسی قدر ترش ہو کے) میں نہیں جانتا۔

بسم اللہ : اے واہ تو تم بالکل ہی خفا ہو گئے۔ جاتے کہاں ہو، ٹھہرو۔

نواب: نہیں بسم اللہ جان ! اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بے کار ہے۔ جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور اب کیا دن پھریں گے۔

بسم اللہ : میں تو نہ جانے دوں گی۔

نواب : تو کیا اپنی اماں سے جوتیاں کھلواؤ گی ؟

بسم اللہ : (مجھ سے) ہاں سچ تو ہے بہن امراؤ۔ آج یہ بڑی بی کو ہوا کیا تھا۔ برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانکی نہیں۔ آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔ بھئی اماں چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں میں نواب سے رسم نہیں ترک کر سکتی۔ آج نہیں ہے ان کے پاس نہ سہی۔ ایسی بھی کیا آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لینا چاہئے۔ آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت ہزاروں روپے اماں جان نے پائے۔ آج زمانہ ان سے پھر گیا تو کیا ہم بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں، گھر سے نکال دیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب اگر اماں زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراؤ میں سچ کہتی ہوں (نواب کا ہاتھ پکڑ کے) کسی طرف کو نکل جاؤں گی۔ لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

بسم اللہ : اچھا تو نواب تم کہاں رہتے ہو ؟

نواب : کہاں بتاؤں۔

بسم اللہ : آخر کہیں تو ؟

نواب : تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ افسوس میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت ہی شرمندہ ہوں۔

میں : یہ وہی مخدوم بخش ہے نا، جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا ؟

نواب : ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا .....

اتنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اس کے بعد نواب بسم اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں کروں گی اور اسی لئے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ کہہ نہ سکی۔ نواب کے تیور اس وقت بہت برے تھے۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں خانم نے جو کی ہیں وہ سب اس نمائش کی تمہید ہے جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے۔ مگر مجھے بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں، تو اور غضب ہو۔

سر شام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئے۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی، اس سے معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا۔ اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ دو گھنٹہ تک انتظار کیا، نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش۔ آخر مایوس ہو کر گھر چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے مکان نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس آئی تھی روتی پیٹتی آئی۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا۔ بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔

اس واقعہ کو کئی دن گذر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ اس واقعہ کے چوتھے پانچویں روز چھبن صاحب کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی۔ بیچنے والے کو علی رضا بیگ کوتوال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے۔ امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا خود امام بخش پکڑ بلایا گیا۔ پہلے تو امام بخش صاف مکر گیا کہ اس

انگوٹھی کو نہیں جانتا۔ آخر جب مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش : حضور! میں لب دریا لوہے کے پل کے پاس حقہ پلاتا ہوں۔ جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ پانچ دن کا ذکر ہے ایک شریف زادے کوئی بیس بائیس برس کی عمر ہوگی، گورے سے تھے، بہت خوبصورت نوجوان تھے۔ سرِشام پکے پل پر نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دئے، مجھ سے لنگی لے کے باندھی۔ خود دریا میں کود پڑے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کئے، پھر میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اور سب لوگ دریا سے نہا نہا کے نکلے۔ کپڑے پہن پہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا کہ کسی طرف تیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہوگئی۔ میں اس آسرے میں کہ اب آتے ہیں اب آتے ہیں پہر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ آخر کو مجھے یقین ہوگیا کہ ڈوب گئے۔ اب دل میں یہ سوچا کہ اگر کسی کو خبر کرتا ہوں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا، کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے بہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر پر لے آیا۔ جیب میں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے، اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے۔ میں نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی کو کبھی نہ بیچتا مگر میرا لڑکا شہدا ہوگیا ہے، وہ چرا کے لے آیا۔

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کئے، وہ انگوٹھی اور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے بڑے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا دیں۔ امام بخش کو سزا ہوگئی۔

بسم اللہ : ہاہا آخر نواب چھبن صاحب ڈوب گئے نہ؟ میں تو سچ کہوں اماں جان کی گردن پر ان کا خون ہوا۔

میں : افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی۔ اسی لئے اس دن ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں گی مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔

بسم اللہ : ان کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو، نہ ان کو جائداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔

میں : خدا جانے ماں کا کیا حال ہوا ہوگا۔

بسم اللہ : سنا ہے بے چاری دیوانی ہوگئی ہیں۔

میں : جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمین لڑکا تھا۔ ایک تو بے چاری رانڈ بیوہ، دوسرے یہ آفت ان کے سر پر ٹوٹ پڑی۔ سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہوگیا۔

رسوا : تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات اور مجھے پوچھ لینے دیجئے۔

میں : پوچھئے۔

رسوا : نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں ؟

میں : کیا معلوم۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں۔

رسوا : اس لئے کہ مجھے میر مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔

(۹)

کچھ ان کو امتحانِ وفا سے غرض نہ تھی
اک زار و ناتواں کے ستانے سے کام تھا

امراؤ : مرزا رسوا صاحب ! آپ کو کسی سے عشق کبھی ہوا ہے ؟

رسوا : جی نہیں۔ خدا نہ کرے۔ آپ کو تو سیکڑوں سے عشق ہوا ہوگا۔ آپ اپنا حال کہئے ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم مشتاق ہیں ، مگر آپ کہتی ہی نہیں۔

امراؤ : تو میرا رنڈی کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے ، جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا ، بات بات پر رو دینا ، دو دو دن کھانا نہ کھانا ، کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا ، سنکھیا کھا لینا ، یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی میں بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان فرشتہ ان کے جعل سے نہیں نکل سکتا تھا۔ ہزاروں ان کے عاشق تھے اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں۔ سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا بھی چہرہ تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے۔ عربی کی اونچی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے۔ معقولات میں ان کا مثل و نظیر نہ تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں ، سن شریف ستر سے کچھ کم ہی ہوگا۔ نورانی چہرہ ،

سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا اس پر عمامہ عبائے شریف۔ عصائے مبارک۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور اس طرح عاشق ہیں۔

ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں۔ اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے بالکل صحیح صحیح ہے۔ آپ کے دوست .... میر صاحب مرحوم جن کو دلبر جان سے تعلق تھا۔ خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے۔ اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا، مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ، شہر کی وضعدار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں۔

رسوا: جی ہاں کہئے میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔

امراؤ: وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ بسم اللہ جان خانم سے لڑکے کچھ دنوں کے لئے اس مکان میں جا کر رہی تھیں جو بزازے کے پچھواڑے تھا۔

رسوا: میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔

امراؤ: خیر۔ مگر بسم اللہ کے دیکھنے کے لئے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں ملاپ کرا دوں میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دو زانوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے کسی کی صورت مجھے کبھی نہ بھولے گی۔ زیتون کی تسبیح چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ یا حفیظ پڑھ رہے ہیں۔ میں جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کے مجھے برابر بٹھا لیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا "تماشہ دیکھو گی؟"

میں: (حیران ہو کر) کیا تماشہ؟

بسم اللہ: دیکھو (یہ کہہ کے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں)۔

مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ۔

مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمین پر گری پڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ وہاں ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادری حکم "چڑھ جاؤ" کہتی ہوں۔

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے۔ عبائے شریف کو تختوں کے چوکے پر چھوڑا۔ نیم کے جڑ کے پاس کھڑے ہوئے، پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اک ذرا چیں بجبیں ہو کے کہا "ہوں"۔

مولوی صاحب پائجامہ چڑھا کے درخت پر چڑھنے لگے۔ تھوڑی دور جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور؟

بسم اللہ: اور۔

مولوی صاحب اور چڑھے پھر حکم کا انتظار کیا۔ پھر وہی 'اور' اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہنچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جاتے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جاں بحق تسلیم ہو جاتے۔ بسم اللہ کی زبان سے نکلنے ہی کو تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی۔ میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا اتر آؤ۔ مولوی صاحب چڑھنے کو تو چڑھ گئے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور جب گرے۔ مگر بہ خیر و عافیت اتر آئے۔ بے چارے پسینے پسینے ہو گئے۔ دم پھول گیا۔ قریب تھا کہ گر پڑیں۔ مگر اپنے کو سنبھال کے نعلین پہن کے تخت کے قریب آئے، عبائے مبارک زیب دوش کیا، چپکے بیٹھ گئے، تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چیونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے۔ اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا : بھئی واللہ بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی۔

امراؤ : دل لگی کا کیا ذکر ہے وہ بے درد چپکی بیٹھی تھی۔ تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود تھے۔ ایک عجیب عالم حیرت طاری تھا۔

رہے گا کیوں کوئی طرز ستم باقی زمانے میں
مزا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا : یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کے لئے کافی ہے۔ تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری آنکھوں کے سامنے بسم اللہ، مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت، میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویریں کھنچ گئیں۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ اچھا غور کر لوں تو ہنسوں۔ نا صاحب! مجھے ہنسی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بے شک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی۔ ستر برس کا بڈھا اس پر یہ حکم۔ درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔

امراؤ : واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑا۔

رسوا : للہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟

امراؤ : ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں لے سنئے:

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا۔

میں : بسم اللہ! یہ تجھ کو کیا ہوا تھا؟

بسم اللہ : کیا؟

میں : ستر برس کا بڈھا اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت میں خون ہوتا۔

بسم اللہ : ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موئے بڈھے سے جلی ہوئی تھی۔ کل

میری دھنو کو اس زور سے دے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی۔

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی اس کا بڑا گہرا سہاگ تھا۔ ذرا اس کے ٹھاٹھ سن لیجیے۔ اطلس کی لہنگریا۔ کامدانی کی کرتی۔ جالی کی اوڑھنی۔ چاندی کی چوڑیاں۔ طوق گھونگھرو۔ سونے کی بالیاں۔ جلیبیاں، امرتیاں کھانے کو، جب مول لی تھی تو موئی ذرا سی تھی۔ دو تین برس میں خوب کھا کھا کے موٹی ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر۔ اجنبی آدمی پر جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے۔ زور بھی اتنا تھا کہ اچھے مرد کا ہاتھ پکڑ لے تو چھڑائے نہ چھوٹے۔

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بسم اللہ جان کو مسخرہ پن سوجھا۔ دھنو کو اشارہ کیا وہ پشت سے چپکے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جو مڑ کے دیکھا بے چارے گھبرا گئے۔ زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں خود چلی گئی ہوگی۔ مولوی صاحب پر کھوکھیانے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی۔ وہ ڈر کے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو چمکار کر دوپٹے کا آنچل اڑھا دیا۔ اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کر کوسا۔ گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا۔ دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا: سزا مناسب تھی۔

امراؤ: مناسبت میں تو کوئی شک نہیں۔ مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔

رسوا: واقعی مولوی صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چہیتی بندریا کو اول تو جھٹک دیا۔ پھر یہ بے ادبی کہ اسے لاٹھی دکھائی، عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گا رہی ہیں۔

طنبورہ چھیڑ رہی ہوں۔ خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔

اتنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ: (دیکھتے ہی) آٹھ دن سے تم کہاں تھے؟

مولوی صاحب: کیا کہوں مجھے تو اب ایسی تپ شدید لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا، مگر تمہارا دیدار کرنا تھا اس لئے جان بر ہو گیا۔

بسم اللہ: تو یہ کہئے وصال ہو گیا ہوتا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو بھڑکا دیا۔

مولوی صاحب: جی ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ: واللہ اچھا ہوتا۔

مولوی صاحب: میرے مرنے سے آپ کو کیا نفع ہوتا؟

بسم اللہ: جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے، گاتے ناچتے، لوگوں کو رجھاتے، آپ کا نام روشن کرتے۔

اسی طرح کی چند باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔

بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی:

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی۔ آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک صاحب گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی، میانہ قد، کسرتی بدن۔ جامدانی کا انگرکھا پھنسا پھنسا پہنے ہوئے، کھلے پائنچوں کا پاجامہ، مخملی جوتا نہایت عمدہ، جالی پر کی چکن کا رومال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا "واہ صاحب! اس دن کے گئے

آج آپ آئے۔ لے بس اب ٹہلئے۔ میں ایسی آشنائی نہیں رکھتی اور وہ لال طاقی گرنٹ کے طاقے کہاں ہیں۔ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔"

وہ صاحب: (لجاجت کے لہجہ میں) نہیں سرکار! یہ بات نہیں ہے۔ اس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی۔ والد کی طبیعت بہت علیل تھی۔ میں ان کی تیمار داری میں تھا۔

بسم اللہ: جی ہاں، آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ بنی کی چھوکری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی دربار داری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں ملتی ہیں اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں کہ والد کی طبیعت علیل تھی۔

اس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔ دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول کے کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی۔ انھوں نے جواب تک نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو چپ سی ہوگئی، مگر پھر ایک ہی مرتبہ تیوری چڑھا کے آپ ہی آپ کہنے لگی 'پھر باشد'۔ اتنا کہہ کے گانے میں مصروف ہوگئی۔

اس دن کے بعد میں نے ان کو کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب برابر آیا کئے۔

رسوا: جی ہاں۔ اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضعدار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سن کے کہ میں یہاں ہوں یہیں چلے آئے۔ ان سے اور بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوج سے لے کے کشتم کشتا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھچھورانہ تھا کہ میں برا مانتی۔

گوہر مرزا میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ اور جیب سے بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

گوہر مرزا : آج خوب گا رہی ہو۔ جی چاہتا ہے .....

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بہ غور صورت دیکھی۔ پھر اپنا کان زور سے پکڑا، جھجک کے پیچھے ہٹا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ ڈر گئے۔ بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشہ ہنس پڑی۔ خلیفہ جی مسکرانے لگے۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا، مگر مولوی صاحب بہت ہی چیں بہ جبیں ہوئے بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں۔ مگر بسم اللہ نے کہا "بیٹھو" بے چارے پھر بیٹھ گئے۔ بسم اللہ بھی کیا ہی شریر تھی مولوی صاحب پر یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا سے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ بھلسے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے کسی پر مجھے رحم آیا۔ میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس میں بسم اللہ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کے کہا" لے اب من چلا پن کر چکے، چلو"

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا سے مجھ سے رسم ہے۔ بسم اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، بہت ہی خوش ہوئے۔ باچھیں کھل گئیں۔

رسوا : مولوی صاحب سے تو پاک محبت تھی نہ ؟

امراؤ : پاک محبت تھی۔

رسوا : پھر ان کو جلنا نہ چاہیے تھا۔

امراؤ : واہ! کیا پاک محبت میں رشک، نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔

رسوا : تو پاک محبت نہ ہو گی۔

امراؤ : اب یہ ان کا ایمان جانے۔ میں تو یہی سمجھتی تھی۔

۱۰

خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی، مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت تھی، رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کوٹ کے بھر دئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، بھرے بھرے بازو، گول کلائیاں۔ جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لئے مناسب تھا۔ اداؤں میں وہ دلفریبی، وہ بھولاپن، جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔ جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجئے، خود اپنے ہاتھوں عمر بھر خراب رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کے لایق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خدا داد تھا، مگر اس حسن و جمال پر خبط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو خود ہی پیار کرنے کے لایق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انھیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی، بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم سب نے صلاح دی، دیکھو خورشید! ایسا نہ کرو، مرد دے

بے مروت ہوتے ہیں۔ تمھارے ان کے صرف آشنائی ہے۔ آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا۔ بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی۔ پچھتاؤ گی۔" آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے، لگے غمزے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ وہ دو دو دن نہیں آتے، خورشید جان دے دیتی ہے، روتی ہے، پیٹتی ہے، کھانا نہیں کھاتی۔ عجیب حال ہے۔ خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی، یہاں تک کہ آنا جانا، کھانا پینا، آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو خوب نباہ ہوتا۔ عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے پیتا بشرطیکہ قدر دان ہوتا۔ بسم اللہ خورشید کے تلووں کی برابری نہیں کر سکتی تھیں۔ اس پر وہ تمکنت، وہ غرور، وہ غمزہ، وہ نکتورا کہ خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں اور آشناؤں سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی ماں کی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ ذاتی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنے آگے کسی کی ہستی ہی نہ تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی پر آواز بالکل نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل پھوہڑ تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول مجرے بہت آتے تھے۔ آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں، لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھا وہ صورت کا مشتاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے، مگر جب آگے دیکھا منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ ان پر عشق سوار تھا۔ ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی۔ یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف رہ گئے۔ ادھر تماشہ دیکھئے کہ پیارے صاحب کے والد پر عتاب شاہی نازل ہوا۔ گھر کی ضبطی ہو گئی۔ جاگیر چھین لی گئی۔ بے چارے محتاج ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو۔ پیارے صاحب نے بپاس خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ کیا۔ خورشید

کی آس ٹوٹ گئی۔

خورشید بہت ہی بھگی عورت تھی۔ سینکڑوں روپیہ پھسلا پھسلا کے لوگ کھا گئے۔ فقیر فقراء سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا۔ ایک دن ایک شاہ صاحب تشریف لائے۔ وہ ایک کے دو کرتے تھے۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی۔ اس میں سیاہ تل بھروائے۔ کڑے کنگن ہانڈی میں رکھ کر چینی ڈھانک دی۔ شال باف کا ایک پرچہ گلے میں باندھ، ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے کہہ گئے کہ آج نہ کھولنا کل صبح کو کھولنا۔ مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی، کالے تلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

ایک جوگی نے کالے ناگ کا پھن منہ سے نکال کے دکھایا کہ یہ تجھے پرسوں آکے ڈس جائے گا۔ بی خورشید نے کانوں کے پتے بالیاں اتار کے حوالے کیں۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج عورتیں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں، رنڈیوں کا کیا ذکر۔ مگر ہاں ایک دن غصہ آیا۔ جس دن پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے۔ اول تو چپکی بیٹھی رہی، تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی۔ رفتہ رفتہ سرخ بھبھوکا ہو گئے۔ اس کے بعد اٹھی مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر ڈالے۔ اب رقت شروع ہوئی، دو دن تک رویا کی، تمام دنیا نے سمجھایا کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی، لینے کے دینے پڑ گئے۔ حکیموں نے دق تجویز کی۔ لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بخود روبہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر چھٹم چھٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر کسی سے دل نہ لگا اور نہ کسی کا دل ان سے۔ اس لئے کہ بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

———————

۱۱

ساون کا مہینہ ہے۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک کے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جا بجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان پر ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ پچھم کی طرف رنگ رنگ کی شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک میں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ تر مجمع کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمعہ کا دن ہے۔ لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھائے چلے جاتے ہیں۔ خورشید، امیر جان، بسم اللہ اور میں، میلے جانے کے لئے بن ٹھن رہی ہیں۔ دھانی دوپٹے ابھی رنگریز رنگ کے دے گیا ہے، چنے جاتے ہیں۔ بالوں میں کنگھی ہو رہی ہے، چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، بھاری زیور نکالے جاتے ہیں۔ خانم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکئے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی ابھی پیچوان لگا کے پیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر اصرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں آج میری طبیعت سست ہے۔ میں نہیں جانے کی۔ ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی بہار ہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جوبن ہے۔ گوری رنگت، ململ کے دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرنٹ کا پاجامہ، بڑے بڑے پائچوں کا، سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پھنسی پھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے۔ ہاتھ، گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل، کان میں سونے کی انتیاں، ہاتھ میں کڑے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے

میں قد آدم آئینہ لگا ہے۔ اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی۔ اگر میری صورت ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اس صورت پر کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ چہرہ اداس اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے دل پسا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے شاعر کا کوئی شعر درد آمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بری نہ تھی، کھلتا ہوا سانولا رنگ، کتابی چہرہ، سُتواں ناک بڑی آنکھیں، سیاہ پتلی، چھریرا بدن، بوٹا سا قد۔ کارچوبی تلواں جوڑا، کاہی کریپ کا دوپٹہ، بنت ٹکی ہوئی، زرد گرنٹ کا پاجامہ، بیش قیمت زیور، سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی ہوئی۔ اس پر طرہ پھولوں کا گہنا۔ عین مین چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس پر بات بات میں شوخی و شرارت۔ میلے میں پہنچ کر کسی کو منہ چڑھا دیا، کسی سے آنکھ لڑائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو منہ پھیر لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگھار کر کے میانوں میں سوار ہوئے میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑیں تھیں کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں، مٹھائی والوں کی دکانیں۔ خوانچہ والے، میوہ فروش، ہار والے، تنبولی، ساقنین، غرض کہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا۔ مجھے تو اور کسی چیز سے کام نہیں۔ لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے، خصوصاً میلے تماشوں میں۔ خوش ناخوش، مفلس، تونگر، بیوقوف، عقل مند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل۔ یہ سب حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگرکھے اور اودی صدری، نکہ دار ٹوپی، چست گھٹنے اور مخملی چڑھویں جوتے پر اتراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی

صاحب ہیں، صندلی رنگا ہوا دوپٹہ، سر سے آڑا باندھے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر، چیں بہ جبیں۔ کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑکے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے انھیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی۔ اماں کا جی ماندہ ہے۔ اماں سو رہی ہوں گی۔ اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جاویں گی۔ ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں۔ کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ ناک میں ننھی سی نتھنی ہے۔ اونچی چوٹی گندھی ہوئی، لال شال باف کا موباف پڑا ہے۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں۔ کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتار لے، کھیئے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب ایک اور ان کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرمائشی گالیاں چل رہی ہیں۔ "اماں، پان تو کھاؤ" کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دوکان پر پھینکا۔ معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں۔ پیسہ دو پیسہ آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقہ والے کو بھی آواز دے دی۔ "بھئی ساقی ادھر آنا۔ حقہ سلگا ہوا ہے؟ ایک اور یار ان کے آموجود ہوئے۔ معمولی گالی گلوج کے بعد ملاقات، سلام بندگی، مزاج پرسی بے تکلف دوستوں میں ہوا کرتی ہے۔" ابے پان تو کھلوا۔" لطف تو یہ ہے کہ آپ مسلمان، یار ہندی۔ جب تنبولی نے پان دیئے، جھپ سے بڑھ کے لے لئے۔ "ابے یار بھول گئے۔" اب یہ کھسیائے ہوئے۔ ٹینٹ سے ایک پیسہ نکالا۔ "لو بھئی ہمیں بھی دو۔ پان دینا۔ الائچی بھی چھوڑ دینا۔ چونا زیادہ نہ ہو۔" (دوست سے) "اچھا لو چلم تو پلواؤ گے۔"

چلم حقہ سے اتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب

سے پیسہ نکال کے دے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا۔ وہیں جا کے ٹھہرے۔ ادھر ادھر درختوں میں پھرتے رہے۔ سر شام سے دو گھڑی رات گئے تک میلہ کی سیر کی۔ پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے۔ ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے مکان پر آدمی گیا، وہ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں۔ "مجھے بالکل نہیں معلوم۔ میں میلہ میں بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے جاتا تو کیوں کر جاتا۔" پیارے صاحب پر یوں بے جا سا گمان تھا۔ ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ نہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا انھوں نے بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ تو اگلی محبت کے خیال سے اور کچھ خانم کی مروت سے نہیں معلوم کس طرح سے چلے آئے تھے۔

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینہ کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں کی ایسی تھی، سانولا رنگ، چھریرا بدن، ایک دوشالہ کمر سے لپیٹے اور ایک سر سے باندھے، میرے کمرے میں درانہ چلے آئے اور آتے کے ساتھ ہی سامنے قالین کے کنارے بیٹھ گئے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے یا ابھی انیلے ہیں۔ رنڈیوں کے یہاں جانے کا کم اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں۔ ان کے آتے ہی وہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں جن میں کچھ میں نے سنیں اور کچھ نہیں سنیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں وہاں سے آ کے پھر باتیں ہوئیں۔ آخر کلام یہ تھا کہ آپ کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینی ہوگی۔ ان صاحب نے کمر سے بینڈ روپیوں کی نکالی۔ بوا حسینی

نے گود پھیلائی۔ انھوں نے چھن سے روپے پھینک دئے۔

بوا حسینی : یہ کتنے ہیں ؟

وہ صاحب : نہیں معلوم ۔ گن لیجئے۔

بوا حسینی : اے مجھے تو نگوڑا گننا بھی نہیں آتا۔

وہ صاحب : میں جانتا ہوں پچھتر روپے ہوں گے شاید، ایک دو کم ہوں یا زیادہ۔

بوا حسینی : میاں پچھتر کسے کہتے ہیں ؟

وہ صاحب : تین بیسی اور پندرہ۔ پچیس کم سو۔

بوا حسینی : پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی ؟

وہ صاحب : پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دے دوں گا۔ پورے ڈیڑھ سو نخرچے آپ کو پہنچ جائیں گے۔

یہ نخرچے کی سن کے مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ یہ ایسے ہی ویسے ہوں گے۔ مگر مجبوری رنڈی کا پیشہ، دوسرے پرائے بس میں۔ کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ تعجب ہوا اس لئے کہ بڑے بڑے رئیسوں سے روپے کے بارے میں ایک دم کے لئے مروت نہیں کرتی تھیں یا اس وقت ایک دن کا وعدہ مان لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہو گی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے کمرے کے نیچے آکے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے اور کہا تو اب میں جاتا ہوں۔ کل شب کو پھر آؤں گا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں، ایک سونے کی، یاقوت کا نگینہ ایک فیروزے کی، ایک ہیرے کی، مجھ کو دیں اور کہا "یہ تم اپنے پاس رکھنا۔ خانم کو نہ دینا۔" میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں پہنیں اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں۔

پھر صندوقچہ کھولا۔ اشرفیاں کو اور انگوٹھیوں کو چور خانہ میں رکھ دیا۔

دوسرے دن شب کو پھر وہی صاحب آئے اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آکر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دئے۔ استادجی اور سازنگئے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استادجی نے کمر میں جو دوشالہ بندھا ہوا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر کی۔ پھر منہ پھوڑ کے مانگا۔ مگر وار خالی گیا۔ انھوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب : استادجی۔ روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہئے موجود ہے۔ یہ دوشالہ میں نہیں دے سکتا۔ ایک دوست کی نشانی ہے۔

استادجی اپنا سا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم ختم ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی پھر گن دئے گئے۔ پانچ روپیہ بوا حسینی کو اپنی طرف سے دئے، وہ رخصت ہوئیں۔ جب وہ اور میں صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے، میں نے پوچھا "آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی"۔

وہ : دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔

میں : اور پھر آئے دو مہینہ کے بعد۔

وہ : میں باہر چلا گیا تھا، اور اب پھر جانے والا ہوں۔

اب میں نے رنڈی پن کی لگاوٹ شروع کی۔

میں : تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے۔

وہ : نہیں، پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔

میں : اور تمھارا مکان کہاں ہے؟

وہ : مکان تو فرخ آباد میں ہے، مگر یہاں بہت کام رہتا ہے بلکہ رہتا یہیں ہوں۔ کچھ دنوں کے لئے باہر چلا جاتا ہوں۔ پھر چلا آتا ہوں۔

میں : اور یہ دوشالہ کس کی نشانی ہے؟

وہ : کسی کی نہیں۔

میں : واہ میں سمجھ گئی، یہ تمھاری آشنا کی نشانی ہے۔

وہ : نہیں تمھارے سر کی قسم میری کوئی آشنا نہیں ہے، بس تمھیں ہو جو کچھ ہو۔

میں : تو پھر مجھے دے دو۔

وہ : میں نہیں دے سکتا۔

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انھوں نے بڑے بڑے موتیوں کا مالا جس میں زمرد کی لڑیں لگی ہوئی تھیں اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھالیا۔ صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی۔ مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھ کو دے دیتے ہیں۔ مگر یہ دوشالہ زیادہ سے زیادہ پانچ سو کا ہوگا، اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو یہ دوشالہ پسند نہ تھا جو میں اصرار کرتی اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے اور کبھی آدھی رات کو، کبھی پچھلے پہر سے اٹھ کے جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں کئی مرتبہ دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کر روانہ ہوگئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گذرا ہوگا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپیوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہوگیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی اور نفرت ہونے کی کیا وجہ! اول تو وہ کچھ بدصورت بھی نہ تھے، دوسرے لینا دینا عجیب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے تھے میری آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمد رفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہوگئی ہوں۔ اس لئے سویرے سے کھسک جاتے تھے اور جو صاحب

جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔ خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی ؛ مگر کہیں سراغ نہ ملا اس اثنا میں فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی۔ جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا تھا۔ اگر میرا دل ابتداء سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہوگیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دل جوئی اور ظاہر داری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بے چارہ میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپیہ پیسہ کی کوئی پروا نہ تھی۔ ایسا دل چاک آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا نہ شہزادوں میں !

رسوا : جی ہاں کیوں نہیں۔ مال مفت دل بے رحم۔ بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا تھا۔

امراؤ : مال مفت کیوں ؟

رسوا : نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور آپ کو اتار کے لا دیا کرتا تھا !

امراؤ : ہمیں کیا معلوم تھا ؟

۱۲

شب کے آنے والوں میں ایک پنا مل چودھری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے انھیں کچھ غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپیہ کا نقد سلوک اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی، یا تو ہر روز آیا کرتے تھے یا دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا۔ اب جو آئے تو اداس اداس۔ معمولی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

پنا مل: کیا تم نے سنا نہ ہوگا؟

میں: کیا؟

پنا مل: ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں چوری ہو گئی۔ پشتینیوں کا اثاثہ اٹھ گیا۔

میں: (چونک کر) ہائیں! چوری ہو گئی۔ کتنے کا مال گیا؟

پنا مل: سب اٹھ گیا، رہا کیا؟ دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔

میں دل میں تو ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھنا مل تو کروڑ پتی مشہور تھے اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بظاہر منھ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پنا مل : جی ہاں ۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں ۔ نواب ملکہ عالم کے یہاں چوری ہوئی ، لالہ ہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی ، اندھیر ہے ۔ سنا ہے باہر سے چور آئے ہوئے ہیں ۔ مرزا علی بیگ بے چارے حیران ہیں ۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے ، کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا ۔ وہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے ۔ پنا مل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا ۔ میں بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوئی ۔ اب جو دیکھتی ہوں تو خلائق کا انبوہ ہے ۔

ایک : آخر گرفتار ہوئے نا ۔

دوسرا : واہ مرزا کیا کہنا ۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو ۔

تیسرا : کیوں بھئی کچھ مال کا بھی پتہ لگا ؟

چوتھا : بہت کچھ برآمد ہوا ، مگر ابھی بہت سا باقی ہے ۔

پانچواں : میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے ؟

چھٹا : وہ کیا آتے ہیں ۔

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں ۔ سپاہیوں کا گارد ساتھ ہے ۔ گرد خلائق کا انبوہ ہے ۔ میاں فیضو منہ پر دوپٹہ ڈالے ہوئے ، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی ۔ دو پہر سے پہلے کا واقعہ ہے ۔

حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے ۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہیں ۔ آتے ہی کہا " آج ہم باہر جاتے ہیں ، پرسوں آئیں گے ۔ دیکھو امراؤ جان جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ۔ بوا حسینی کو نہ دینا نہ خانم کو دکھانا ۔ تمھارے کام آئے گا ۔ ہم پرسوں ضرور آئیں گے ۔ اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لئے باہر چل سکتی ہو ؟"

میں : تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں ۔ خانم صاحب کو اختیار ہے

تم ان سے کہو اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے۔

فیض علی : سچ ہے کہ تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔

میں نے بوا حسینی کو آواز دی وہ آئیں۔

فیض علی : (میری طرف اشارہ کرکے) بھلا کچھ دنوں کے لئے باہر بھی جا سکتی ہیں ؟

حسینی : کہاں ؟

فیض علی : فرخ آباد۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری وہاں ریاست ہے۔ بالفعل میں دو مہینے کے لئے جاتا ہوں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔

بوا حسینی : مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔

فیض علی : اچھا تم پوچھو تو۔

بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بے کار تھا اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز منظور نہ کریں گی۔

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کچھ عذر بھی نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر نہال کر دے گا۔ میں اس خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آکر صاف جواب دیا کہ ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

فیض علی دوگنی تنخواہ پر سہی۔

بوا حسینی : چوگنی تنخواہ پر بھی نہیں ممکن۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔

فیض علی : خیر! جانے دو۔

بوا حسینی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس معلوم ہوا۔

معشوقوں کی بے وفائیوں کا تذکرہ قصہ کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے افسوس ہوتا تھا، برا کہتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر اس کا ساتھ نہ دیا تو میری بے وفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں : اچھا تو میں چلوں گی۔

فیض علی : چلوگی ؟

میں : ہاں، کوئی جانے دے یا نہ جانے دے۔ میں ضرور چلوں گی۔

فیض علی : کیوں کر ؟

میں : چھپ کے۔

فیض علی : اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔ پہر رات رہے تمھیں یہاں سے نکال لے چلیں گے۔ دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

میں : میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں۔ تم سے وعدہ کر چکی ہوں۔ میرے وعدے کو بھی دیکھنا۔

فیض علی : بہت اچھا، دیکھا جائے گا۔

اس رات کو فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے میرے پاس سے اٹھ کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی۔ وعدہ تو کر لیا، مگر دیکھئے کیا ہوتا ہے، جاؤں یا نہ جاؤں۔

جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدہ کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیے

مگر جیسے کوئی منع کرتا تھا کہ نہ جاؤ خدا جانے کیا ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی کوئی بات طے نہ ہوئی۔ دن بھر یہی باتیں دل سے رہیں، رات کو اتفاق سے کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی آخر نیند آگئی۔ صبح کو ذرا دن چڑھے سویا کی۔ گوہر مرزا نے کچی نیند میں آکر جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔ مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ دن بھر نشے کا خمار رہا۔ نہیں معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہو گئی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بات یہ تھی کہ کہیں باہر سے مجرا آیا تھا۔ بوا حسینی نے مجھ سے کہا "جاؤ گی"؟ اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ بوا حسینی نے کہا "واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو۔ آخر اس پیشے میں ہو کر کرو گی کیا؟" میں نے کہا "میں تو نہ جاؤں گی"۔ بوا حسینی نے کہا "نہیں جانا ہو گا۔ خاص تمھاری فرمائش ہے اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے۔ روپیہ بھی لے لیا ہے"۔ میں نے کہا "بوا! میں نہیں جانے کی، روپیہ پھیر دو"۔

بوا حسینی : بھلا تم جانتی ہو۔ خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟

میں : چاہے کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو۔ اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔

بوا حسینی : آہا! اب تم بڑی روپیہ والی ہو گئی ہو، لاؤ پھیر دو۔

میں : کتنا روپیہ ہے؟

بوا حسینی : سو روپیہ ہے۔

میں۔ سو روپیہ لو گی یا کسی کی جان؟

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی : بڑی کھری ہو تو دے دو۔

میں : شاء لو دے دوں گی۔

بوا حسینی : وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ شام تک کے لئے کیوں مانیں گے؟

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھے تھیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ مجرے پر راضی ہو جائے گی۔ میرے صندوقچہ میں اس وقت کچھ نہ ہوں گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی تو اشرفیاں تھیں۔ زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں : جاؤ گھنٹہ بھر میں لے جانا۔

بوا حسینی : گھنٹہ بھر میں کیا موکل دے جائیں گے؟

میں : ہاں دے جائیں گے۔ جاؤ بھئی مجھے اس وقت دق نہ کرو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔

بوا حسینی : آخر کچھ کہو تو لڑکی کیا ہوا۔

میں : مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے۔

بوا حسینی : (ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا) ہاں سچ تو ہے۔ پنڈا پھیکا ہے۔ مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہوگا۔ جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا؟ روپئے کیوں پھیرے جائیں۔

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چل دیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اسی وقت دل میں بدی آگئی۔ دل نے کہا واہ جی! جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے تو ان کے ساتھ رہنا بےکار ہے۔

رسوا : کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا؟

امراؤ : کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟

رسوا : اس لئے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراؤ : یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔

رسوا : کھلی ہوئی بات تو ہے مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔

امراؤ : وہ باریکی کیا ہے؟ خدا کے لئے جلدی کہئے۔

رسوا : فیض علی کے ساتھ نکل جانا وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا۔ اب دل بہانے ڈھونڈ رہا تھا کہ کیوں کر نکل چلوں۔

امراؤ : نہیں یہ بات نہ تھی میں دو دلی ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا۔ جب تک رات کو فیض علی آئے تھے ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے پکا ارادہ ہو گیا تھا۔

رسوا : جی نہیں پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا اسی لئے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بری معلوم ہوئی ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہوگا۔

امراؤ : میں نے مانا کہ ایسا ہوگا۔ اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے "امراؤ نہ جا کہا مان"۔ جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچے لیتا ہے کہ نہ جا مگر میں نے نہ مانا۔

رسوا : یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔

امراؤ : اچھا میں سمجھی، یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

رسوا : جی نہیں یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کون سا اچھا کام تھا۔ آپ

کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں۔ اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو اس کے کرنے پر مجبور کیا ہو۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔

بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسن سلوک نے آپ کو اس کے ساتھ نکل چلنے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اس اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔

عیش باغ کے میلے میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے شوق سے سنا تھا۔ فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے مگر اس کی شکل و شمائل، رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ کچھ خطرہ ضرور ہے۔ مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپیہ کی لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے تھے۔ افسوس اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اس کے دام میں نہ آتیں۔

امراؤ: میں پڑھنوں گی کسی کتاب کا نام لیجئے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے پچھم کی طرف بازار ہے۔ اتر، دکھن، اونچی اونچی رنڈیوں کے کمرے ہیں۔ ایک طرف بیبا جان کا مکان ہے، دوسری طرف حسینی باندی رہتی ہیں۔ پچھواڑے میر حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرض کہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے۔ جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازے پر رہتا تھا کیوں کہ فیض علی رات گئے آیا کرتے تھے اور پہر رات سے چلے جاتے تھے۔ دروازے بند کرنے اور قفل لگانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے چل نکلنے کے مشورے ہوا کئے۔ اتنے میں مکا نے انگڑائی لی معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے کمرے

میں بلایا "ایک روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا۔ ہم جاگ رہے ہیں کوئی ڈر نہیں۔"

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا "لو اب چلو" میں اٹھی، دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے۔ زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی سے کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی، اکبری دروازہ کی طرف کا راستہ لیا۔ نخاس میں بیل گاڑی پہلے ہی سے کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے اور چل نکلے۔ ہنڈولہ کے ناکہ سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سائیس گھوڑا لئے ہوئے ملا وہ بھی بہل کے ساتھ ہو لیا۔ صبح ہوتے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرا میں دوپہر تک قیام ہوا۔ بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دال ارہر کی بے نمک پھیکی
مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کے مناسب کپڑا خرید ا میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے پہن کے آئی تھی اتار کے گٹھری میں باندھے۔

رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنؤ سے آئی تھی رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ پر کی۔ لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شاموں شام پہنچ گئے۔ رات بھر سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کو بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی، نصیبن نام تھا۔ گونے پاتے سے درست تھی۔ کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصباتیوں کا ایسا تھا۔ میرے اس کے دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبن : آپ کہاں سے آئی ہیں؟

میں : فیض آباد سے۔

نصیبن : فیض آباد میں تو میری بہن پیاری رہتی ہے۔ آپ ضرور جانتی ہوں گی۔

میں : (آخر پہچان گئی ناکہ میں بھی رنڈی ہوں)۔ میں کیا جانوں۔

نصیبن : فیض آباد میں کون ایسی پتریا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔

میں : بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اسی لئے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔

نصیبن : آخر پیدائش تو تمھاری فیض آباد کی ہے۔

میں : (یہ تو سچ کہتی ہے۔ اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی مگر بچپنے سے باہر رہی۔

نصیبن : تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتیں ؟

میں : کسی کو نہیں۔

نصیبن : یہاں کیوں کر آنا ہوا ؟

میں : ان کے ساتھ ہوں۔

نصیبن : اور جاؤ گی کہاں ؟

میں : اناؤ۔

نصیبن : لکھنؤ ہوتی ہوئی آئی ہو ؟

میں : ہاں۔

نصیبن : پھر سیدھا راستہ چھوڑ کے ادھر بھیڑ میں کہاں آئی ہو؟ نریت گنج ہو کے اناؤ چلی گئی ہوتیں۔

میں : رائے بریلی میں ان کا کچھ کام تھا۔

نصیبن : میں نے اس لئے کہا کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ پلیہ کی بھیڑ میں سیکڑوں کو لوٹ لیا۔ اناؤ کا راستہ ادھر ہی سے ہو کے ہے۔ تم تین آدمی ہو۔ جس میں دو مرد ایک عورت ذات۔ تمھارے ہاتھ گلے میں گہنا بھی ہے۔ بھلا تمھاری کیا حقیقت ہے۔ وہاں تو براتیں لٹ جاتی ہیں۔

میں : تن بہ تقدیر۔

نصیبن : بڑی دل کی کڑی ہو۔

میں : پھر کیا کروں؟

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضروری نہیں اور نہ مجھے یاد ہیں۔ ہاں میں نے پوچھا "تم کہاں جاؤ گی؟"

نصیبن : ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔

میں : نہیں سمجھی۔

نصیبن : اے لو گدائی نہیں جانتیں کیسی پتریا ہو۔

میں : بہن میں کیا جانوں گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔

نصیبن : ہمارے دشمن بھیک مانگیں۔ اور سچ پوچھو تو میں کہوں پتریا کی ذات بھیک منگنی ہے۔ اس میں ڈیرے دار ہو یا نہ ہو۔

میں : ہاں سچ تو ہے۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا گدائی کسے کہتے ہیں؟

نصیبن : سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ امیر رئیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔ جو کچھ جس کے مقدور میں ہوتا ہے ہمیں دیتا ہے۔ کہیں مجرا ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔

میں : اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں۔

نصیبن : ہاں اب سمجھیں۔

میں : یہاں کسی رئیس کے پاس آئی ہو؟

نصیبن : یہاں سے تھوڑی دور پر ایک شمبھو دھیان سنگھ راجہ کی گڑھی ہے۔ انہیں کے پاس گئی تھی۔ راجہ صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے۔ ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن ٹھہری رہی۔ آخر دم گھبرایا یہاں چلی آئی۔ یہاں سے دو کوس پر ایک

گاؤں ہے سمر یہا وہ گاؤں بالکل پتریوں کا ہے۔ وہاں میری خالہ رہتی ہیں کل ان کے پاس جاؤں گی۔

میں : پھر کہاں جاؤ گی ؟

نصیبن : میں ٹھہری رہوں گی۔ جب راجہ صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤں گی اور بہت سے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

میں : کیا راجہ صاحب کو ناچ مجرے کا بھی شوق ہے ؟

نصیبن : بہت شوق تھا۔

میں : کیوں اب کیا ہوا ؟

نصیبن : جب سے ایک پتریا لکھنؤ سے لائیں ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔

میں : اس پتریا کا نام کیا ہے ؟

نصیبن : نام تو مجھ کو یاد نہیں۔ صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے ذرا چھرے ٹھرے کی اچھی ہے۔

میں : گاتی خوب ہوگی۔

نصیبن : خاک گانا وانا نہیں آتا۔ ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجہ صاحب اسی پر لٹو ہیں۔

میں : کتنے دنوں سے وہ پتریا آئی ہے ؟

نصیبن : کوئی چھ مہینے ہوئے ہوں گے۔

رات کو میں نے فیض علی سے راستہ کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انھوں نے کہا خاطر جمع رکھو، ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔

(۱۳)

دوسرے دن منھ اندھیرے موہن لال گنج کی سرا سے روانہ ہوئے۔ نصیبن کی گاڑی ہمارے پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیبن باتیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی دور چل کے سمریہا ملا۔ نصیبن نے دور سے ہم کو وہ گاؤں دکھایا۔ سڑک کے کنارے کھیت تھے۔ ان میں کچھ گنواریاں پانی دے رہی تھیں۔ کچھ کھیت نرا رہی تھیں۔ ایک پرائی چل رہی تھی اس میں ایک مسٹنڈی عورت دھوتی باندھے بیل ہنکار رہی تھی۔ ایک پرے رہی تھی۔ نصیبن نے کہا یہ سب پتریا ہیں۔ میں نے دل میں کہا واہ پیشہ بھی کیا، پھر اس قدر محنت جو مردوں سے مشکل ہو۔ آخران کو پتریا ہونا کیا ضرور تھا مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لایق ہیں۔ لکھنؤمیں جو کنڈے والیاں، دہی والیاں، گھوسنیں آتی ہیں ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبن یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دو کوس جا کے ایک نشیب ملا۔ جا بجا بھیڑ، بڑے بڑے غار۔ سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی۔ کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلتے دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھایا۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی۔ یہ جادہ جا بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا پھر ندی کے اس پار جا کے معلوم ہوا۔

ہماری گاڑی اسی طرح چلی جاتی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا۔ سائیس گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور وہ گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے۔ تھوڑی دیر میں گنواروں نے آکر گاڑی کو گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ بندوقیں کندھے پر تھیں۔ توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار : (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں ؟

گاڑی بان : یہ سواری بریلی سے آئی ہے۔ اناؤ کا بھاڑا کیا ہے۔

گنوار : روک گاڑی۔

گاڑی بان : گاڑی کیوں روکیں۔ خاں صاحب کے یہاں کی زنانی سواری ہے۔

گنوار : کوئی مرد ساتھ نہیں ہے ؟

گاڑی بان : مرد آگے بڑھ گئے ہیں۔ آتے ہوں گے۔

گنوار : اترو بی گاڑی سے۔

ایک : پردہ کھول کے کھینچ لو۔ سسری پتریا تو ہے اس کا پردہ کون۔

ایک گنوار آگے بڑھا۔ گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ تین آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب گھوڑے قریب آئے میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے۔ پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑھ ماری۔ اس میں دو سوار ادھر کے گر پڑے، پھر تلواریں میان سے نکلیں۔ سوار سر ہی پر آگئے تھے، ادھر سے بھی تلواریں کھنچ گئیں۔ دو ایک ہاتھ چلے ہوں گے تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کے گرے۔ ایک سوار اور ادھر گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔ اچھا کہاں جاؤ گے ؟ دیکھو ندی اس پار کیا ہوتا ہے۔

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اس

کے پٹیاں کسی گئیں۔ وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سوار ہماری گاڑی کے ادھر ادھر ہیں۔ کچھ سوار آگے آگے ہیں کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی: (اپنے ساتھی سے) بھائی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی: یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے!

فیض علی: ہاں یہ تو کہوگے۔

فضل علی: کہیں گے کیا، تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے۔ ذرا بھابی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں۔

فیض علی: آپ سے کوئی پردہ ہے۔ دیکھئے۔

فضل علی: ڈیرے پر چل کے بامراد دیکھیں گے۔

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچ گئی۔ کنارہ بہت اونچا تھا۔ مجھ کو گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی پر تھا اس کے زخم گاڑی کے تکان سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا۔

ندی اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے، گاڑی دھوئی گئی۔ پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آچکا تھا۔ مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس ایک باغ تھا۔ اس میں چھولداریاں پڑی ہوئی تھیں۔ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے، یہاں آکر ہماری گاڑی رکی۔ ہمارے ساتھ کے سواروں کو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے آگے بڑھا۔ اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا۔ فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے

آئے۔ فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی : اچھا دیکھا جائے گا۔ کھانا تو کھالو۔

فضل علی : کھانا کھانے کی مہلت نہیں۔ ایسے میں نکل چلو۔

فیض علی : اچھا جب تک چھولداریاں اکھاڑی جائیں، گھوڑوں پر زین کسے جائیں، ہم لوگ کھانا کھالیں۔

میں گاڑی سے اتری، آم کے درخت کے نیچے دری بچھادی گئی۔ سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں۔ تھئی کی تھئی روٹیاں موٹی موٹی ٹوکریوں میں آئیں۔ میں، فیض علی اور فضل علی کے تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ چہروں پر تشویش کے آثار تھے، مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا چھولداریاں اکھاڑ کے ٹٹوؤں پر لادی گئیں۔ زین کسے گئے۔

آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آکر گھیر لیا۔ ادھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے، دونوں طرف گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں۔ کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں۔ یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ راجہ دھیان سنگھ کے آدمی بہت سے تھے۔ ایک پر دس ٹوٹ پڑے، بہت سے زخمی ہوئے۔ فضل علی اور فیض علی موقعہ پا کر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی اور گرفتار ہوئے۔ انھی گرفتاروں میں میں بھی تھی۔

۱۴

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑی بان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سوار کو میدان میں ڈال دیا جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لے کے بریلی کی طرف راہی ہوا۔ مردوں کی مشکیں کسی گئیں۔ گڑھی کی طرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی پانچ کوس تھی، تھوڑی دور جا کے راجہ صاحب اور ان کے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجہ صاحب خود گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجہ : یہی بی صاحبہ لکھنؤ سے آئی ہیں؟

میں : (ہاتھ باندھ کے) حضور قصوروار تو ہوں لیکن اگر غور کیجئے تو ایسا قصور بھی نہیں۔ عورت ذات جعل فریب سے آگاہ نہیں، میں کیا جانتی تھی۔

راجہ : اب بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ قصور آپ کا ثابت ہے۔ جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں ان کا جواب دیجیے۔

میں : جو حکم حاکم۔

راجہ : لکھنؤ میں کہاں مکان ہے؟

میں : ٹکسال میں۔

راجہ : (آدمیوں کو اشارہ کر کے) دیکھو تمت کھیڑے سے ایک بیل گاڑی لے لو۔ لکھنؤ کی رنڈیاں ہیں۔ ہمارے دیس کی پتریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات

کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔

میں : حضور کو خدا سلامت رکھے۔

آدمی گئے۔ گڑھی سے گاڑی لے آئے۔ مجھے گاڑی پر بٹھایا اور لوگ اسی طرح مشکیں کسے ساتھ ساتھ تھے۔

گڑھی میں پہنچ کر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیج دئے گئے۔ میں کوٹ میں بلائی گئی۔ ستھرا مکان رہنے کو دیا گیا۔ دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا۔ پوریاں، کچوریاں، مٹھائیاں طرح طرح کے اچار کھانے کو۔ لکھنؤ کے چھوڑنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کے کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ کو روانہ کر دئے گئے۔ مجھ کو رہائی کا حکم ہے، مگر ابھی راجہ صاحب رخصت نہیں کریں گے۔ پہر دن چڑھے راجہ صاحب نے بلا بھیجا۔

راجہ : اچھا ہم نے تم کو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بدمعاش نکل گئے اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ میں پہنچ کر اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ بے شک تمھارا کوئی قصور نہیں ہے مگر آئندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا۔ اگر تمھارا جی چاہے، دو چار دن یہاں رہو، ہم نے تمھارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔

میں : (نصیبن کی وہ بات یاد آئی کہ راجہ صاحب کے پاس لکھنؤ کی کوئی رنڈی ہے۔ ہو نہ ہو اس نے میری تعریف کی ہوگی) حضور نے کس سے سنا؟

راجہ : اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی رنڈی کون؟ خورشید جان۔ خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی۔ دونوں مل کے رونے لگے۔ آخر راجہ صاحب کے خوف سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مودب بیٹھ گئے۔ سازندے طلب ہوئے۔ رہائی کی خبر سن کے میں نے حسب حال ایک غزل کہہ لی تھی، بہت سے شعر تھے۔ جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجہ صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی محفوظ

تھے۔ بے خودی کا عالم تھا۔ غزل یہ ہے :

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں
خوشنوایان چمن زاد رہا ہوتے ہیں

تو کبھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو
کوئی ہم اے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں

حسرت اے ذوق اسیری کہ خفا ہے صیاد
آج ہم بادل ناشاد رہا ہوتے ہیں

خاطر نازک صیاد کو برداشت نہیں
باعث نالہ د فریاد رہا ہوتے ہیں

غم دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں
قید ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں

کیوں نہ رشک آئے ہمیں تازہ گرفتاروں پر
ہم تو اے لذت بے داد رہا ہوتے ہیں

اے ادا قید محبت سے رہائی معلوم
کب اسیر غم صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجہ صاحب نے پوچھا ادا کس کا تخلص ہے ؟

خورشید نے کہا "خود انہی کی کہی ہوئی ہے" راجہ اور بھی خوش ہوئے۔

راجہ : اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز نہ رہا کرتے۔

میں : غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسی کا تو افسوس ہے ، مگراب تو حضور حکم دے چکے اور لونڈی آزاد ہو چکی۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجہ صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے۔ خورشید سے مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید : دیکھو بہن ! میرا کوئی قصور نہیں ، خانم صاحب سے اور راجہ صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجہ صاحب نے کئی مرتبہ مجھ کو بلوایا ، انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ کے میلے میں ان کے آدمی لگے ہوئے تھے ، مجھ کو زبردستی اٹھا لائے۔ جب سے یہیں ہوں۔ ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے۔ سب طرح کا آرام ہے۔

میں : موئے گنواروں میں خوب تمھارا جی لگتا ہے۔

خورشید : یہ بات سچ ہے مگر میری طبیعت کو جانتی ہو، روز ایک نئے شخص کے پاس جانا بالکل خلاف ہے وہاں یہی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جانتی ہو۔ یہاں صرف راجہ صاحب سے سابقہ ہے اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ میرا وطن ہے یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں : تو تمھارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے ؟

خورشید : مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں ، بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں : یہاں تو نہ رہوں گی۔ مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید : لکھنؤ جاؤ گی ؟

میں : نہیں۔

خورشید : پھر کہاں ؟

میں : جہاں خدا لے جائے۔

خورشید : ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں : ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی۔ خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجہ صاحب سے میں نے عرض کیا:

میں : حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے ؟

راجہ : ہاں۔ تو پھر کیا جانا چاہتی ہو ؟

میں : جی ہاں۔ اب لونڈی کو رخصت کیجئے۔ پھر حاضر ہوں گی۔

راجہ : یہ لکھنؤا فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤ گی ؟

میں : کانپور۔

راجہ : لکھنؤ نہ جاؤ گی ؟

میں : حضور لکھنؤ کیا منھ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہوگی، ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجہ صاحب سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہوگی کیوں کہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید خانم کوئی آفت برپا کرتیں۔

راجہ صاحب میرے اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجہ : تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی ؟

میں : لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے۔ جہاں رہوں گی، کوئی نہ کوئی قدر دان نکل ہی آئے گا۔ خانم کی قید میں اب مجھے رہنا منظور نہیں، اگر وہاں رہنا ہوتا تو نکل کیوں آتی۔

میں نے راجہ صاحب کو یقین دلا دیا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجہ صاحب نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں، ایک دوشالہ دیا، ایک رومال، ایک رتھ مع تین بیل کے۔ غرض کہ مجھے ڈیرا دار پتریا بنا دیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کئے۔ اناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سلا در بھٹیارے کے مکان پر ٹھہری۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سرِ شام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں، مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں۔ میاں مسافر ادھر، ادھر۔ مکان جھاڑا ہوا ہے۔ حقہ پانی کو آرام۔ گھوڑے ٹٹو کے لئے نیم کا سایہ......

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے۔ سرا کے پھاٹک ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میرے اس کے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا۔ میرا حال پوچھا اس کے بعد میں نے فیض علی کا حال پوچھا۔ اس نے کہا ان کو آپ کے اناؤ

آنے کی خبر مل گئی ہے۔ آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور آجاویں گے۔

یہ سن کے میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تمت کھیڑے کے واقعہ کے بعد میں سمجھی تھی کہ اب گلو خلاصی ہوگئی۔ اناؤ میں فیض علی جان پر نازل ہوگئے۔ معمولی بات چیت کی، اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کرو۔ سائیس گاڑی ہنکائے گا۔ میں خود گھوڑے کو دیکھ لوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ گاڑی سلاور بھٹیارے کے پاس چھوڑ دو۔ راتوں رات گنگا اس پار اتر چلو۔ اب کیا کرسکتی تھی۔ فیض علی کے بس میں تھی۔ جو انھوں نے کہا مجھے چار و ناچار منظور کرنا پڑا۔ فیض علی نے سلاور کو پکارا۔ کنارے لے جاکر دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا۔ سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زین کا چلنا، رات کا وقت، میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا۔ آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی۔ اس پار اترے، فیض علی نے کہا "اب کوئی خوف نہیں ہے"۔ صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے۔ فیض علی نے مجھ کو لاٹھی محال میں اتارا خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آکے کہا "یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مکان ہم نے ٹھہرا لیا ہے وہاں چلی چلو"۔ ڈولی کرایہ کی کی۔

تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالیشان مکان کے دروازہ پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں دو کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہے اس پر ایک عجیب قطع کا حقہ رکھا ہوا ہے جسے دیکھتے ہی پینے سے مجھے نفرت ہوگئی۔ مکان کا قرینہ دیکھ کے دل کو دہشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا "اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں"۔ میں نے کہا "بہتر ہے، مگر ذرا جلدی آنا"۔ فیض علی بازار کو گئے۔ میں اسی میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنئے! فیض علی بازار جو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ ایک

گھڑی دو گھڑی۔ پہر دو پہر کہاں تک کہوں، دوپہر گذری۔ شام ہونے کو آئی اناؤ میں سرِ شام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان، نیند کا خمار، صبح سے منھ پر چلو پانی تک نہیں پڑا۔ ٹکڑا تک نہیں کھایا۔ بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا۔ اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات ہو گئی۔ یا خدا اب کیا کروں۔ منھ کھول دیا۔ اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈار مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ہیہات خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کوٹھری سے کوئی نکلا۔ وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے پر دھم دھم کی آواز آئی۔ زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہو گئی اب تک انگنائی اور دیواروں پر چاندنی تھی۔ اب چاند بھی چھپ گیا، بالکل اندھیرا گھپ ہو گیا۔ آخر میں دو شالے سے منھ لپیٹ کے پڑ رہی۔ پھر کچھ کھٹکا ہوا۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ آخر جوں توں کر کے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجیب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کس مصیبت میں جان پڑی۔ لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمرہ یاد آتا تھا۔ ادھر ایک آواز دی، ادھر آدمی مستعد۔ حقہ، پان، کھانا، پانی جو کچھ ہوا ادھر منھ کیا ادھر سامنے موجود۔ خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہو گئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور ہی گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔ میرا ہواؤ کھلا ہوا تو نہ تھا مگر پھر بھی سیکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے تو اکثر گلی کوچوں سے واقف، یہاں کی بھی سرا دیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس خالی مکان میں بیٹھی رہتی۔ جھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ دس بیس قدم گئی ہوں گی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے، گھوڑے پر سوار، دس پندرہ برق انداز ساتھ، ان کے حلقہ میں میاں فیض علی ٹنڈیاں کسی ہوئی، سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سن سے ہو گئی۔ وہیں ٹھٹک گئی۔ ایک پتلی سی گلی ملی۔

اسی گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں درانہ اندر چلی گئی، یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے، سر منڈا ہوا، ایک نیلی تہمت باندھے ہوئے، دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے "کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

میں : مسافر ہوں خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا۔ ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام فریب میں آ گئے۔

مولوی : (تھوڑی دیر بعد سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں : جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی : (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں : جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی : لاحول ولا قوۃ۔

میں : اوئی۔ مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی : جی ہاں۔ تو میں اکیلا رہتا ہوں۔ اسی سے تو میں نے کہا، مسجد میں آپ کا کیا کام ہے؟

میں : یہ کیا خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا؟ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں۔ یہ خوب کہی۔ آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی : میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں : آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی : لاحول ولا قوۃ۔

میں : لاحول ولا قوۃ۔ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے ؟

مولوی : شیطان آدمی کا دشمن ہے اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔

میں : خدا سے ڈرنا چاہیئے ، موئے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا ، آدمی ہیں ؟

مولوی : ذرا بگڑ کے جی ہاں اور کون ہوں ؟

میں : مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے۔

مولوی : پھر کیا کریں ؟ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں : اسی سے تو آپ کے چہرے پر دحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا ؏

تنہا منشین کہ نیم دیوانگی است

مولوی : اجی وہ کچھ سہی جس حال میں ہم ہیں ، خوش ہیں ، آپ اپنا مطلب کہیئے۔

میں : مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا ، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی : چہ خوش !

میں : چرا نہ باشد !

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

رسوا : یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی ؟

امراؤ : اے ہے۔ اس کا حال نہ پوچھو بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا : جی ہاں جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے۔ چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ : بس یہی سمجھ لیجیئے۔

رسوا : اچھا تو مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا؟

امراؤ : کیا کہوں کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے۔ صورت بھی کچھ بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی، چہرے پر حونق پن تھا، سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی مگر کچھ ایسی بے تکے پن کی حد سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہمت بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی ٹوپی جو سر کی پوری چوحدی کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا، پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکہ دار داڑھی کچھ عجب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا : کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟

امراؤ : جی نہیں جگالی کر رہے تھے۔

رسوا : اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں۔ جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

امراؤ : اور سنئیے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر

لیا کرتے تھے۔

رسوا : تو یہ عین تمیزداری ہے۔ اس لئے کہ عندالتقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہوگا۔

امراؤ : کچھ اور بھی عرض کروں ؟

رسوا : بس اب معاف کیجئے یہاں تو صبح ہوگئی۔

امراؤ : القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

مولوی : (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے۔ جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے) اس کی کیا ضرورت تھی؛

میں : (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی۔ اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے کسی سے کچھ کھانے کو تو منگا دیجئے۔

مولوی : (اب جھینپے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک۔ سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) اسی سے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ؟

میں : امکان بالقوۃ یا بالفعل۔ بالذات یا بالغیر؟

مولوی : بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہوگا۔ آپ بھی کھا لیجئے گا۔

میں : بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں اور یہاں ضرورت نے اکل میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے۔ لہذا بازار سے کچھ لا دیجئے۔

مولوی : اک ذرا صبر کیجئے کھانا آتا ہی ہوگا۔

میں : اب صبر کرنا تکلیف مالایطاق ہے اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف صاحب ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد

میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی : اس وقت تو فی نفس الامر کچھ نہیں ہے، مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہوگا۔

میں : اور بہ فرض والتسلیم لوکان محالا اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہوگا۔ میری شرکت اس میں یعنی چہ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مصداق ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود .....

مولوی : آہا۔ آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں : مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی : واقعی ایسا ہی ہے مگر.....

میں : (بات کاٹ کر) مگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی : اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں : للہ ذرا جلدی جائیے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لاکے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی : (فوراً ساڑھے چودہ گنڈے پیسے، کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کے سامنے رکھ دئے) سنئے صاحب چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسہ کا سالن ہے۔ دھیلا بھانج (روپیہ کا خوردہ) میں گیا۔ آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی، مگر بھوک بری بلا ہے۔

جلدی جلدی نوالے اٹھانے شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں : میں نے کہا مولوی صاحب ! کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے ؟

مولوی : تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے۔

میں : حلوائی کی دکان تو ہوگی۔

مولوی : حلوائی کی دکان ؟ یہ تو مسجد کے نیچے ہے۔

میں : تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے۔ موئے کتوں کا راتب۔

مولوی : ایسا تو نہ کہئے، آدمی کھاتے ہیں۔

میں : آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا شوربا۔

مولوی : نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو دہی لا دوں ؟

میں : جی نہیں رہنے دیجئے، معاف کیجئے

مولوی : پیسہ کا خیال نہ کیجئے میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد کے باہر چلے گئے اور ایک آبخورے میں خدا جانے کب کا سڑا، کھٹا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات ماردی۔

بہرطور میں نے وہ چاروں روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی چھوڑ کے یونہی اٹھ کھڑی ہوئی، پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑے رہنے دئے۔

(میں ہاتھ دھونے اٹھی تھی۔ مولوی صاحب سمجھے مسجد سے دفان ہوتی ہے)۔

مولوی : اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

میں : میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجئے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔ کانپور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انہی کی معرفت ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ نواڑی پلنگ، دری، چاندنی، چھت پردے، تانبے کے برتن اور سب ضرورت کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانا پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کو۔ دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے، ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیا مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگئے کانپور کے، ذرا سمجھ دار تھے، بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرہ پر گانے بجانے کا چرچا ہونے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کمبخت ہوگا جو کسی جلسہ میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کما لیا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا راہ رویہ بول چال پسند نہ تھی۔ بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا۔ مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کر رہنا پڑے گا۔ کیوں کہ اس پیشہ میں رہ کر خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہ ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچر کیوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے

کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدردانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے یہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جاکر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے: ایک صاحب میرے کمرے پر تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹتے ہی انھوں نے پوچھا۔ آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کون شارق؟ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے، فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب: میں تو سنتا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں: جی ہاں، غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب: بھلا کہیں ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں۔

میں: لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان کے نام بر آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہوگا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں۔

وہ صاحب: (چیں بہ جبیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ۔ تخلص شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلائق ہے۔ ہاں ہاں۔ آپ نہیں جانتی نہ جانیں۔

میں: حضور! معاف کیجئے گا میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلّی ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہئے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو، نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب : میر ہاشم علی صاحب شارق۔

میں : اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے لگی۔ یا الٰہی! یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب : جی ہاں! مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں : بجا ارشاد ہوا۔ یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں؟

وہ صاحب : انہی صاحبوں کے ہم عصر ہیں۔

میں : بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب : کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے؟ خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا۔ عام شہرہ تھا۔

میں : تو آپ کو یاد ہوگا؟

وہ صاحب : مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا۔ وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان زد ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

میں : ذرا ارشاد کیجیے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب : نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری۔

میں : سبحان اللہ! اس بند کے تو دردر دور شہرے ہیں، پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجیے، کیا کلام ہے!

وہ صاحب : (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں! آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق۔ حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں، تعجب ہے۔ اچھا اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں تو آیا کہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جئیں گے تو ایسا بند نہیں

کہہ سکتے۔ مرزا دبیر صاحب مرحوم کا کلام ہے۔ مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا: واقعی آپ نے بڑی عقل مندی کی ورنہ بے چارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبان کا یہی شمار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جاکے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا کے لے گئے۔ حیدرآباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی۔ مگر سمجھنے والے سمجھ ہی گئے۔ لکھنؤ میں خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ ہنس کر چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گذر گئی۔ خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آکر رہے، چلئے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ؟

امراؤ: جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور میں میرا آنکھوں دیکھا یہی حال تھا۔

اس زمانہ میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا بلکہ شہر کے کاملین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے۔ اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا: فی زمانہ یہی حال دکن کا ہے۔ لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں، مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ: جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی موچ نکالیں۔

رسوا: کیا خوب بات کہی ہے۔ واقعی روزمرہ تو کسی قدر آبھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا۔

۱۵

اتفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کب سے بچھڑے ہوئے۔ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے : کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گذر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کا دن ہے کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں، ماما باورچی نمانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا۔ لکھنؤ سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرہ یہی ہے ؟ درگا بنیا (جس کی دوکان نیچے تھی) نے جواب دیا۔ "ہاں یہی ہے" پھر دریافت کیا۔ "دروازہ کہاں ہے ؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا۔ کمر جھکی ہوئی۔ سفید ململ کا دوپٹہ۔ تن زیب کا کرتہ، نین سکھ کا پاجامہ بڑے بڑے پائچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں۔ ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں ایک

کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا، وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی : لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں : جی ہاں۔

اتنا کہہ کے میں پلنگ کے نیچے اتر آئی۔ پاندان آگے کھسکایا۔ آدمی کو حقہ کے لئے آواز دی۔

بڑی بی : ہماری بیگم نے تمھیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ جلسہ ہوگا۔ تمھارا مجرا کیا ہے۔

میں : بیگم صاحبہ مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی : اے تمام شہر میں تمھارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمھارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحبہ خود بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں : اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟

بڑی بی : تم نے کیوں کر جانا؟

میں : کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے؟

بڑی بی : ہاں! میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا اپنا مجرا تو بتاؤ، ابھی بہت کام پڑا ہے۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں : مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے، سب جانتے ہیں۔ پچاس روپیہ لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحبہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انھوں نے قدر کر کے بلایا ہے تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے۔

بڑی بی : آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کچہری کا تو لو، باقی وہاں آکے سمجھ لینا۔

میں : (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں، روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب یہ کہیے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی : مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے۔ یہ لڑکا شام کو آئے گا اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمھارے ملنے والوں میں سے تمھارے ساتھ نہ ہو۔

میں : اور سازندے؟

بڑی بی : سازندے، خدمت گار، ان کی مناہی نہیں ہے، کوئی اور نہ ہو۔

میں : جی نہیں، یہاں میرا کون سا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھیے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھا چونا لگا کے، ڈلیوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پان دان کے ڈھکنوں پر کچل کے، گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی : ہائے بیٹا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں : آپ کھائیے تو۔ میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی بیٹھ گئیں، پان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری۔ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔

میں : اگرچہ مجرے کا دستور نہیں ہے۔ مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سیکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے لڑکا

آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے آگے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرداگرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے برہے بنے ہوئے تھے، ان میں صاف موتی سا پانی بہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جو اب پانی پہنچا تھا کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے۔

سال گرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شیام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ آپ ہی آپ گایا کی۔ پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے ہل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر بہت عالیشان کوٹھی تھی، وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے ناندے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ تھا، اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا۔ پانی کے گرنے

کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک۔ ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا۔ مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر سبز مرد نگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لئے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دئے۔ سازندوں سے کہا: "تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ۔ کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔" جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب برآمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انھوں نے مجھ کو قریب بلایا۔ خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی۔

حیرانیٔ نگاہ تماشہ کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے، چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھویں، بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں، لمچھوئی ناک، چھوٹا سا دہانہ، پتلے پتلے نازک ہونٹ —— نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضاء کا تناسب اور ابھار پن کس قدر خوشنما تھا۔ سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گذر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھمک ملتی تھی۔ مگر کہاں خورشید

کہاں وہ۔ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھرکم پن۔ دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آئندہ پہر اداسی برستی تھی۔ جب دیکھو بردگن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ ہنستے ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں۔ مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رئیسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین، بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا۔ پیلی کا شلوکہ پھنسا پھنسا، سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھ میں سونے کی سمرنیں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوبصورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقل حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجیے گا ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا، کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی، دو سامنے کھڑی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لٹیا، دوسری کے پاس خاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انھوں نے سلسلۂ کلام اس طرح سے شروع کیا:

بیگم : تمھارا کیا نام ہے؟

میں : (ہاتھ باندھ کے) امراؤ جان۔

بیگم : خاص لکھنؤ میں مکان ہے ؟

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا۔ خصوصاً اس موقع پر اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں میرا مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے) :

میں : جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔

(جواب دینے کو دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لئے کہ فوراً بیگم صاحبہ نے پوچھا) :

بیگم : تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے ؟

(اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا آخر اس بات کو ٹال کے) :

میں : حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے ؟

بیگم : کبھی لکھنؤ میں تھا۔ اب تو کانپور وطن ہو گیا۔

میں : میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم : کیوں ؟

میں : (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں۔ بے کار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم : چلو اچھا ہے تو ہمارے پاس کبھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں : آنا کیسا۔ میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اوّل تو آپ کی قدر دانی،

دوسرے یہ باغ، یہ فضا۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو، خصوصاً ایسی خفقانی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب وہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم : اے ہے، تمھیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات، یہاں تو خدا کی ذات۔ شہر سے کوسوں دور، چار پیسوں کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا ہوا شام کو آتا ہے۔ چھائیں پوئیں شیطان کے کان بہرے۔ کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں یہاں آدمی کا کام تمام ہو جائے۔

میں : حضور اپنی اپنی طبیعت۔ مجھے تو پسند ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم : جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے اور سب باتوں کو جانے دو، جب سے نواب کلکتہ گئے ہیں راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دئیے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس بارہ مرد نوکر ہیں، عورتوں کی گنتی نہیں مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب کمی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں : قصور معاف آپ کا مزاج وہمی ہے۔ ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر عافیت کھلے گی، وہ گرمی ہے کہ آدمی بکسے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں کہ خدا اپنی پناہ میں رکھے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کے آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا خوب صورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر

لے لیا۔ بڑی دیر تک لئے رہی اور پیار کیا کی۔ پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں : یوں تو شاید نہ آتی مگر میاں کو دیکھنے تو ضروری ہی آؤں گی۔

بیگم : (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں : ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دوبھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی۔ اسی اثنا میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا تو کھالو۔

میں : بہت خوب۔

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا۔ تم یہیں ٹھہرو ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں : واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔

بیگم : تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے؟

میں : جی نہیں۔ اچھا، کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم : (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟

مہری : (ہاتھ باندھ کے) حضور دلوا دیا گیا۔

بیگم : اچھا انھیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لئے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا "مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔"

میں : مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم : اچھا تو آج کچھ نہ کہو، چلو کھانا کھالیں، اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔

میں : پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم : ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے اس پہ گانا۔

میں : بہت خوب۔

اب ہم کوٹھی کے پاس پہنچ گئے بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا۔ اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گذرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر کمرہ، فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان چنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور بھی منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔ صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقرخانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرضکہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ... طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی، مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا۔ ہاتھ منھ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسہ میں صرف بیگم صاحبہ نہ تھیں چٹھی نویس۔ مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، ماما ئیں سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں۔ مجھے گانے کا حکم

دیا۔

کھاتے کھاتے دس گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں، ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالیشان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک بانگ بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا اپنا راگ گا رہے تھے۔ جھینگر آس دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مرد نگوں کی روشنی تھی، ان کے کبھی شیشے سبز۔ یا تاروں کا عکس جو تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا۔ سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ

دھڑک رہا تھا۔ دل ہی میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا، بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے اور بھی دلوں کو ہلا دیا۔ اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منھ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم نے گاؤ تکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں۔ میں بھی ہڑکے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں، مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منھ پر ڈھاٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں، دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار سب اسی طرف کو چلے۔ کوئی نہتہ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے سے فرار ہو گئے۔ پانچ چار آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔ انھوں نے آکر عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز: (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو، ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو: جس ارادے سے آئے ہیں تمھیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز: وہی میں پوچھتا ہوں۔ جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو: ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ مارے کا بیر ہے؟ ہاں

جس ارادے سے آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہوگے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز: (کسی قدر سخت ہوکے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لوگے۔ اگر یہ مقصد ہو.....

سرفراز پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا، کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا:

کوئی ڈاکو: نا صاحب۔ کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے؟

اس آواز پر مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔

سرفراز: (خوش ہوکے) تو پھر یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو ہم ابھی تمھیں کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ جو جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی اتروا دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بنک گھر میں جمع ہے۔ علاقہ سے جو روپیہ آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو: اس سے بہتر کیا ہے مگر دیکھو اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز: سپاہی کے پوت دغا نہیں دیتے، خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی آگے بڑھا۔ "واہ کیا کہنا، مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا کنجیاں؟"

اتنا کہنا تھا کہ میرے اس کے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے تو پہچان لیا، بولنے کا قصد کیا، مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا "بھابی! تم یہاں کہاں؟"

میں: جب سے تمھارے بھائی قید ہوگئے یہیں ہوں۔

فضل علی : یہاں کس کے پاس ؟

میں : رہتی تو شہر میں ہوں مگر یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں ان سے ملنے آئی تھی ؟

فضل علی : تمہاری بہن کہاں ہیں ؟

میں : یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بے چاری غش میں پڑی ہیں۔ میری طرح تو ہیں نہیں۔ بے چاری پردہ نشین ہیں۔ جوانی میں رانڈ ہوئی جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہے۔

فضل علی : (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسہ کی چیز لینا تو میرے نزدیک حرام ہے اور نہ اس معاملہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو : یہ کیا ؟ پھر آئے کیوں تھے ؟

فضل علی : جس ارادے سے آئے تمھیں معلوم ہے مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے ؟ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا ؟

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا۔ مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے : "فاقوں مرتے ہیں ایک موقع ملا بھی تو اسے خاں صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں ؟"

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور سیاہ فام شخص یہ کہتا ہوا نکلا :

وہ شخص : خاں صاحب ! میں بھی تمرے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اسے بلایا

علیحٰدہ لے جاکے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپیہ جو بیگم صاحبہ نے انعام دئے تھے چپکے سے اسے دے دئے۔

فضل علی : (سرفراز خاں سے) بھائی میں تمھارے ساتھ ہوں اب تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز : میں ان لوگوں کو ابھی راضی کئے دیتا ہوں مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ سرکار غش میں پڑی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کر دیں گے۔

ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی۔ ان کے منہ پر چھینٹے دئے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا سنبھل کے بیٹھئے۔ خدا کے صدقے سے وہ آفت ٹل گئی، خاطر جمع رکھئے اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کر اٹھایا۔ سب اٹھ اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خاں کو بلا بھیجا۔

سرفراز : سرکار کچھ دے دیجئے۔ بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔

میں نے اس بات کا جواب کچھ نہ دیا۔ اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقعہ پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔

میں : جی نہیں میں نے کیا کیا، یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا پانچ سو نقد اور پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انھیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم : کیوں امراؤ جان ! باغ میں رہنے کا مزہ دیکھا ؟
میں : حضور سچ کہتی تھیں ۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے ۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے ۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی ۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھوا دیا گیا ۔ نیند کسے آتی ہے ۔ رات بھر جاگ رہی ۔ صبح ہوتے سب سو گئے ، میری آنکھ بھی لگ گئی ۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آگئے ، مجھے جگوایا ۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی ۔

خدمت گار : آپ تو خوب یہاں آئیں ۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے ۔
میں : کیوں کر آتی ۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا ۔
خدمت گار : اچھا تو اب چلئے ، لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں ۔
میں سمجھ گئی ۔ ہوں نہ ہوں ، بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے ، آخر پتہ لگا لیا نہ ۔
میں : اچھا چلتی ہوں ۔ سواری لائے ہو ؟
خدمت گار : حاضر ہے ۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا ، دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں ۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جائیے گا ۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے ۔ بیگم صاحب خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی ۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی ۔

۱۶

گھر پر جو آکے دیکھتی ہوں، بوا حسینی اور میاں گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی : اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمھیں کسی کی محبت ہی نہیں؟

میں بجائے خود شرمندہ تھی۔ جواب کیا دیتی۔ چھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ، انھوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے۔ بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی بھی آئی تھی۔ وہ دن کانپور سے اسباب وغیرہ کے خریدنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ پر کر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئے۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان وہی کمرہ وہی آدمی :

دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

۱۷

دیکھئے ، پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر
صرصرِ دحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانہ تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانہ میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسند ریاست پر بٹھایا، میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارکباد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیرا تھا۔ آج اس کا گھر لٹا، کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے ان کا تعین در دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے اس لئے اکثر دیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لئے کبھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانہ میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سال گرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی :

غیرت مہتاب ہے برجس قدر گوہر نایاب ہے برجس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی اس کا مطلع یہ ہے :

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوا : امراؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ : گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم، سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں، وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا۔ نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچہ پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پان دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہول جول میں پان دان کیسا جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوا : بھلا کچھ یاد ہے کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ : دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا : ہاں تمھیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کون سی تھی؟

امراؤ : اخیر جاڑے تھے۔ نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا : بالکل درست۔ مارچ کی سولھویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراؤ : جی ہاں۔ بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستہ میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں "لو صاحب، ان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا"۔ تیسرے صاحب افیون کو پیٹ رہے تھے۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے، اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں

اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

رسوا : سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

امراؤ : آپ نے سنا ہے، میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا : اچھا اس قصہ سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اس کا کیا حشر ہوا؟

امراؤ : (ایک آہ سرد بھر کے) اے ہے، یہ نہ پوچھئے۔

رسوا : غدر میں سب لٹ گیا؟

امراؤ : غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا : پھر کیا ہوا؟

امراؤ : سارا قصہ دہرانا پڑا! جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔ خانم کے مکان کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان سے ہاتھ جوڑ کے کہا اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انھوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا لیتی۔ مگر واہ ری بیوی! ایک حبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھما ہوا ہے نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا : بھلا کتنے کا مال ہو گا؟

امراؤ : کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا : اور اب کیا ہوا؟

امراؤ : کیا ہوا۔ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا : مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمھارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا۔ سب مال تمھارے پاس ہے۔

امراؤ : اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا : لوگ کہتے ہیں تم نے اپنا بھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں میں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک اور خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ : خدا رازق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے۔ اس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا : اچھا! تو پھر کیا ہوا؟

امراؤ : اب کیا بتاؤں ایک مہربان .....

رسوا : میں سمجھ گیا یہ گوہر مرزا صاحب کی حرکت ہوگی۔

امراؤ : میں اپنے منہ سے نہیں کہتی شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا : بے شک تمھارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ دیکھیے، وہ چین کر رہے ہیں اور تمھیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ : مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا، نہ رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں؟

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہو گئی

رسوا : اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ : وہ کاہے کو تشریف لائیں گے ؟ میں اکثر جایا کرتی ہوں ۔ ان کی بیوی سے محبت ہو گئی ہے ۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا : جب بھی کچھ دے ہی آئی ہو گی۔

امراؤ : جی نہیں ۔ میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا : تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے کٹے لگا ؟

امراؤ : مرزا صاحب ! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے ، ہاتھوں کا میل ہے ۔ فقط بات رہ جاتی ہے ۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں ، کبھی ننگی بھوکی نہیں رہتی ۔ آپ ایسے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے ۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا : اس میں کیا شک ۔ وہ تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں ، اب بھی سو سے اچھی ہزار سے اچھی ۔ واللہ یہ تمھاری نیت کا ثمرہ ہے ۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ : جی ہاں مولا نے سب مرادیں پوری کیں ۔ اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں ۔ میری مٹی عزیز ہو جائے ۔ مرزا صاحب ! میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی ۔ مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا ۔ مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا تو پھر نہ آؤں گی۔

۱۸

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمھیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں اتری۔ پھر تر پولئے کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لئے۔ گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گذر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے، دل لگا ہوا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے۔ اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت، غدر، برجیس قدر، یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گذر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے "خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب، وہ اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔" گھر کا خیال آتے ہی وہ

باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لئے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیوں کر بنے گی۔ وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بے کار ہے اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے۔

ایک دن میں کمرے پر بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت، ادھیڑ سے، تشریف لائے، میں نے پان بنا کے دیا۔ حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں : اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے ؟

نواب صاحب : اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا بالکل نیا انتظام ہے۔

میں : اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب : ہاں تھے مگر تم انھیں کیا جانو۔

میں : غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب : وہی جمعدار نا، جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی ؟

میں : مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب : یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں۔ مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے

پہلے وہی کرتے تھے۔

میں : ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب : تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا ؟

میں : اس دن ان کے ساتھ۔ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے، بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب : جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا۔ اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلہ کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا، اسی کے نیچے نمگیرہ تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی ۹ بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے دہشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں۔

وہ گلے لگالیں گی۔ مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا "ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ اک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے"۔

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا "تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں : ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)

عورت : اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمھیں کوئی بلاتا ہے۔

میں 'اچھا' کہہ کے اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی تھی کہیں، اور پڑتا تھا کہیں۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکے کھڑی ہوئیں۔

ایک : لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں : جی ہاں۔

دوسری : تمھارا نام کیا ہے؟

میں : (جی میں تو آیا کہ کہہ دوں مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی : تمھارا وطن خاص لکھنؤ ہے؟

میں : (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی : تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں : (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے، بمشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری : کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں : ذات کی پتریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی : (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو تم کون ہو؟

میں : (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں، اب بالکل تاب ضبط نہ تھی۔ سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا "کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے"۔

دوسری : ہائے میری امیرن!

یہ کہہ کر لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آ کے چھڑایا۔ اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک نہ بھولے گی۔ مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ مجرے کا واپس دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو، کوئی آدھی گھڑی رات گئے، ایک جوان سا آدمی، سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر

آیا۔ میں نے حقہ بھر دا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا "پان لے آؤ۔" اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان : کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی)۔

میں : ہاں۔

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان : (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں : (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان : ہم تو سمجھے تھے کہ تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں : بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان : بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہتیں۔

میں : خود اتنی سمجھ نہ تھی، نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔

جوان : اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو اس محلہ میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں : ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟

جوان : اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں : اب کیا ہوتا ہے۔

جوان : (بہت ہی غصے ہو کے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے۔ اب۔ (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) "یہ ہوتا ہے۔" اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے "ارے

دوڑو، بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔"

جوان : (چھری گلے سے ہٹا کے ، ہاتھ چھوڑ دئے) عورت کو کیا ماروں؟ اور عورت بھی کون؟ بڑی ..... ؟

اتنا کہہ کے دہاڑیں مار مار رونے لگا۔

میں پہلے سے رو رہی تھی ، جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی ، جان کے خوف سے ایک دہچکا سا کلیجہ پر پہنچا تھا۔ اس سے دم بخود ہوگئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا ، کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا ، ایک کنارے کھڑی ہوگئی۔

(جب دونوں خوب رو دھو چکے)

جوان : (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں : کل چلی جاؤں گی ، مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان : بس۔ اب دل سے دور رکھو ، معاف کرو۔ کل اماں نے تمھیں گھر پر بلا لیا۔ میں نہ ہوا ، نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں : تم نے دیکھ لیا ، جان سے تو میں ڈرتی نہیں مگر ہائے تمھاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان : برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں : اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماما نے ادر جان کھانا شروع کی "یہ کون تھے"۔

میں : رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے، تمھیں کیا؟
بہرطور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی، صبح کو اٹھ کے لکھنؤ چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

۱۹

لکھنؤ میں آکر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک ، وہی کمرہ ، وہی ہم ہیں ۔ اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتہ چلے گئے تھے ، کچھ اور شہر میں نکل گئے تھے۔ شہر میں نیا انتظام ، نئے قانون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا، چاروں طرف دمدمے بنے ہوئے تھے ؛ جا بجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ گلیوں میں کھڑنجے بنائے جاتے تھے ، نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرض کہ لکھنؤ اور اب ہی کچھ ہو گیا تھا۔

میں دو چار مہینے خانم کے مکان پر رہی۔ اس کے بعد، بہ لطائف الحیل، ایک علیحدہ کمرہ لے کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی ہو گئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج کے خلاف نہ گذرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کر کے چلی آتی تھی۔ اسی زمانہ میں نواب محمود علی خان صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کیے۔ پھر نوکر رکھا، اس کے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا تھا کہ لکھنؤ میں رہوں اور قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب صاحب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب

نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی، مقدمے کی پیروی میں ہزاروں روپیہ صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی، یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں: "مار ڈالوں گا۔ ناک کاٹ لوں گا"۔ اس زمانہ میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لئے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں آدمی فینس کے ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوج داری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا کہ نواب صاحب بے شک درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی۔ خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانہ میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا، ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ، چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروائیوں میں مشاق، جعل سازی میں استاد، جھوٹے مقدمات بنانے میں وحیدِ عصر، عدالت کو دھوکا دینے میں یکتائے زماں۔ میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ حق تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے نواب سے سر بر نہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے لئے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعویٰ تھا۔ لیکن مقدمہ اس سلیقہ سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کئے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گھٹے پڑے، بڑے بڑے عمامے سر پر، عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں گنٹھے پاؤں کفششیں۔ بات بات میں قال اللہ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ ناکح کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق۔ جرح میں بگڑ گئے۔

نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے اور انہی کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوج داری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے، بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانہ تک رہی۔ انھوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ برے آدمی کبھی بالکل برے نہیں ہوتے۔ کسی نہ کسی سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس کا پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کسی کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ ہوتا رہا، میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بھیجا ہوا خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح کا نقصان پہنچائے۔ اکبر علی خاں کچہری سے پلٹ کے یہیں آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر انھوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار کبھی نہ تھا۔ میں بھی انہی کے ساتھ کھانا کھاتی تھی۔ اس زمانہ میں، میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔ اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہو یا غلط مگر ان کا اعتقاد یہی تھا۔

رسوا: یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لئے مجھے اتنا کہہ لینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

امراؤ: میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے۔

رسوا: عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات

تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہِ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو) جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے اس کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر اس کا برا اثر پڑا ہو۔ تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہوگا :

می خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان ! یاد رکھو۔ مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے اس کی بخشش کہیں نہیں ہے، اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے۔

امراؤ : میرا تو بال بال میاں گنہگار ہے۔ مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں۔

رسوا : مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہو گی۔

امراؤ : پھر یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ اسی دل آزاری کی بدولت لاکھوں روپے ہم نے کمائے۔ ہزاروں اڑائے۔

رسوا : پھر اس کی کیا سزا ہوگی ؟

امراؤ : اس کی کوئی سزا نہ ہونی چاہئے۔ ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔

رسوا : کیا خوب !

امراؤ : فرض کیجئے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں دیکھ لیا، مرنے لگے۔ کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لئے مل سکتے نہیں۔ ان کا دل دکھتا ہے۔ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ اپنا دل۔ ان کی جان پر بنی ہے۔ پھر! ہماری بلا سے۔ بعض صاحب ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں چاہو۔ ہم نہیں

چاہتے، اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے، پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا: یہ سب گولی مارنے کے لائق ہیں مگر برائے خدا کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجیے گا۔

امراؤ: خدا نہ کرے! آپ خوش باشوں میں ہیں۔ نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا: یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے، نہیں بھی ہے۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراؤ: میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک چاہنا عقل مندی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک بے وقونی کے ساتھ۔

رسوا: اس کی مثال؟

امراؤ: پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں، میں آپ کو۔

رسوا: خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا دل ہی جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلئے دوسری مثال۔

امراؤ: خیر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے کی مثال سنئے جیسے فریاد رس الٰہی۔

رسوا: نہیں اس مثال میں آپ نے غلطی کی اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ: اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا: آپ بھی کیا دقیانوسی خیال ڈھونڈ کے لائی ہیں۔

امراؤ: اچھا جیسے ..... نظیر.....

رسوا: (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد ہے سن لیجئے:

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم   ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

امراؤ : ہاں وہ کلکتہ والا معاملہ۔

رسوا : اتنی دور کہاں پہنچیں ؟ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے ؟

امراؤ : دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا : ہاں میں نے سنا تھا، آپ اکبر علی خاں کے گھر میں بیٹھ گئیں تھیں ؟

امراؤ : مجھ سے سن لیجئے۔ جس زمانہ میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے تھے اور میں روپوش ہوئی ہوں اس زمانہ میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس زمانہ میں تین آدمی اس دھوکہ میں تھے کہ میں اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی، دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا : میں بتادوں ؟

امراؤ : گوہر مرزا ؟

رسوا : جی نہیں۔

امراؤ : تو پھر اور کون ؟ بتائیے۔

رسوا : آپ بتائیے۔

امراؤ : ایسے فقرے کسی اور کو دیجئے۔

رسوا : فقرہ کیسا۔ میں بھی ایک پرچے پر لکھ کے رکھے دیتا ہوں، پھر آپ بتائیے۔

امراؤ : بہتر۔

رسوا : پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہئے۔

امراؤ : تیسرے میں خود۔

رسوا : پرچے میں لکھا تھا "آپ خود"۔

امراؤ : واہ مرزا صاحب ! خوب پہچانا۔

رسوا : آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گذری ؟

امراؤ : گذری کیا سنئے :

اول تو انھوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جاکے اتارا، جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ موا کچا سا مکان۔ ایک چھوٹی سی دلینیہ، آگے چھپر، ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا، اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے ؟ باورچی خانہ۔ اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جایا کریں۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین، چھوٹتے ہی بھوجی کہنے لگے۔ ان کے بے تکے پن نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے تنگ ہوگئی۔ ہر ستے "بھوجی، پان نہ کھلاؤ گی ؟"

ایک دن دو دن۔ آخر مروت کہاں تک ؟ انتہا یہ کہ پان دان میں نے ان کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہوگئی۔ انھوں نے قبضہ کر لیا جیسے کوئی مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بد تمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلھیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں۔ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا۔ چکنی کے چورے اور الائچی پر بسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگاتے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر خصوصاً کھانے کے وقت تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں کہ اکبر علی خاں کے برادر نسبتی تھے، ان کے مذاق میں فحش حد اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ رات دن قانون چھٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو اک ذرا امن ہو جاتی تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ

کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی خاں کسی مقدمے میں فیض آباد گئے، افضل علی اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں۔ دروازے کی کنڈی بند کرلی ہے، میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نہ خواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں۔ آخر میں نے کہا "اللہ بیٹھ جائیے"۔ بارے بیٹھ گئیں۔

میں : ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی، آج ادھر کہاں تشریف لائی ؟

بیوی : تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں۔

میں : جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم ہو تو مناسب بھی ہے۔

بیوی : لے باتیں نہ بناؤ اگر میرا گھر ہے تو تمھارا بھی گھر ہے اور سچ پوچھو تو نہ میرا نہ تمھارا۔ گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں : جی نہیں ! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو ——— ان کا بھی ہے اور آپ کا بھی۔

بیوی : تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں، میاں کا حکم نہ ہوگا۔

میں : میاں کے حکم کی تو کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہوگئی۔ اب حاضر ہوں گی۔

بیوی : اچھا تو چلو۔

میں : چلیے۔

مکان میں جا کے جو دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے مٹکے، دیگ، گگرے، پتیلیاں، لوٹے، نواڑی کے پلنگ، مسہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش،

مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جلا بجا کوڑا پڑا ہوا، باورچی خانہ میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چکتے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر منوں کوڑا۔ امامن نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے تو میرا جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا۔ میں نے چٹکی میں دبا لیا۔ باتیں کرنے لگی۔ اسی اثنا میں محلہ کی ایک بڑھیا آنکلی۔ زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا: "یہ کون ہیں؟"

بیوی : اب تمھیں کیا بتاؤں۔

میں چپکی رہی اور بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے) "اوئی! جیسے میں جانتی نہیں"۔

میں : بڑی بی۔ پھر جانتی ہو تو اس کا پوچھنا کیا۔

بڑھیا : اوئی بی۔ تم سے میں بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں۔ میرا منھ تم سے بات کرنے کے لایق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

(میں بڑھیا کا منھ دیکھ کے چپ ہو رہی)

بیوی : اوھی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔

بڑھیا : (بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو، جیسے ہم دشمن ہیں اے، ہم تو ان کی بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں۔ یہ ہمیں سے الٹے بگڑتی ہیں۔

بیوی : لے بس، اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو۔

بڑھیا : ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔

(بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ منھ پھیر کے ہنسنے لگی)۔

بیوی : کیوں نہیں ۔ اے تم میری سوت ہو (میری طرف مخاطب ہو کے) لے سن لو ، خاں صاحب کی پہلی بیوی یہی ہیں ۔ تو بیوی ، تم اصل میں ان کی سوت ہو ۔ میں تو ان کے بعد آئی ہوں ۔

بڑھیا : ہوں ، ہوتے سوتوں کی ، مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں ۔ منھ زور منھ کالیاں دیتی ہو ۔ موئی کسبیوں ، خانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی ؟ یہی تو سیکھو گی ۔

لو ، اتنے دن مجھے آئے ہوئے ، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ) نے ایک بات مجھے نہیں کہی ۔ بہو صاحب گن ذتی ایسی ہیں کہ محلہ کی بڑھیوں کو گالیاں دیتی ہیں ۔

بیوی : (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا ، لڈن کی ماں تم آج سے میرے پاس نہ آنا ۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کے بیٹھا کرو ۔

(مجھے بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے ۔ اس کے منھ کون لگے ؟ ضبط کر کے چپکی ہو رہی) ۔

بڑھیا : ہماری بلا آتی ہے ۔

بیوی : موئی کی شامتیں آئی ہیں ۔ یہ بلا بوغمہ کیا بک رہی ہے ؟

بڑھیا : تو کیا تمھارے دبیل ہیں ۔ کچھ کسی کے لینے دینے میں نہیں ، گھڑی بھر نکل آتے تھے ۔ تم ہم سے ، ہم تم سے بات کرتے تھے ۔ نہ آئیں گے ۔

بیوی : ہرگز نہ آنا ۔

بڑھیا : اس ضد پر تو ضرور آئیں گے ۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو ۔

بیوی : آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا ۔

بڑھیا : کیا تاکت ، کیا مجال ۔ منھ بنواؤ ۔ جوتیاں ماریں گی بچاری ۔

بیوی : لے اٹھو ، یہاں سے ٹلو ۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی ۔

بڑھیا : (ایک ٹھٹھا لگا کر) آج تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے ۔ مارو ۔ بڑے

باپ کی بیٹی ہو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ تھر تھر کانپنے لگیں

بیوی : دور ہو یہاں سے، کہتی ہوں۔

بڑھیا : اب تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے۔

بیوی : (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی۔

میں : بیگم! جانے بھی دیجئے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا : (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا، مال زادی۔ تجھے تو کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی : (جوتی پیر سے لے کر) ایک۔ دو۔ تین۔ اب راضی ہوئیں؟

میں : بیگم، جانے دیجئے (ہاتھ سے جوتی چھین لی)۔

بیوی : نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا : اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر پانچ چار اور لگائیں، اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دئے اور زمین پر دو ہتڑ مارنا شروع کئے "ہے ہے ہے! ہے ہے، مجھے جوتیاں ماریں! اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن مجھ پر اتاری، ہائے مارا۔ ہائے مارا۔" چلا چلا کے دوہائی دینا شروع کی۔ باورچی خانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دالان سے چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہوگئی۔ بڑی بیگم کو آتے دیکھ کر اور کلّے دو ہتڑ مارنا شروع کئے۔ "اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں"۔

بیگم صاحب : اے مجھے کیا معلوم کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں، نہیں تو آکے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا : (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔ ارے اس

نے مار کھلوائی۔

(میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا۔ کچھ کہتے نہیں بن پڑتا)۔

بیوی : پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔

بڑھیا : ہم تو نام لیں گے۔ تم کیا کرتی ہو۔

بیگم صاحب : آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا : مجھ نگوڑ ماری نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا، کیا گناہ کیا؟

بیوی : تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں۔ پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا : کیا مطلب تھا۔ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو سہی اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم : چل شفتل، تو کیا بدلہ لے گی؟ ذرا کسی بھلاوے پر نہ پھولنا۔

بڑھیا : میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہے کہہ لو، تمھارا حق ہے۔

بیگم : تیرے والی کی ایسی تیسی، نکل یہاں سے۔

بڑھیا : لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔ (یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی " بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں، جاتے ہیں دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں")۔

بیگم صاحب : (بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی : اماں جان! آپ کے سر کی قسم میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھری کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سینکڑوں باتیں تو ان بے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی

بات تو ناگوار نہیں ہوئی کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی۔ مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب: (میرے چلے آنے کے بعد ہو سے) اونھی بیٹا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا اور پھر موئی ایک شفتل بازاری کے لئے۔ آخر تمھیں اس کی پرچاک لینا کیا ضرور تھا۔

امیرن: اچھا اس کو جانے دیجئے، جیسی اس نے بدزبانی کی تھی، اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھیے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیسا اور وہ بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی مانامت ڈالتی اور خود فرض کرکے جا کے بلا لائیں۔

بیگم: (امیرن سے) ان کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں؟ باہر جس کا جی چاہے آئے۔ گھر میں کسی کا کیا کام ہے؟ اے لو، ان سے (اکبر علی خاں کے باپ)۔ برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ ان نے کیسی منتیں کیں، میں نے نہیں، حامی بھری۔ بوا امیرن! میں یہ سوچی کہ آج کو ہمان طریق کھڑی ترٹی چلی آئے گی، کل میاں گھر میں بٹھا لیں گے، تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن: سچ ہے بیگم صاحب! اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے؟ اگلے لوگ کہتے تھے: ایک درجہ مرد کو گھر میں بلائے مگر بدعورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم: بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے، بھاگڑ کے دنوں میں برسوں حسین خاں، ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا رہنا سہنا۔ مگر مجال ہے، انھوں نے میرا آنچل بھی دیکھا ہو، بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحنچی میں گھٹی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اصیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن : ایک تو یہ کہ تم سحنک کی کھانے والی بیوی کی صاحبزادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی کہاں تک بچاؤ ہوگا۔ کہیں اس نے کتھے چونے کی کلھیوں میں ہاتھ ڈال دیا۔ تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا۔ دوسرے موئی ٹکاھیاں، ان کا اتبار (اعتبار) کیا؟ سینکڑوں عارضے میں بھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پرچھائیوں سے بچنا چاہیئے۔

بیگم صاحب : ایک بات۔ سبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہیئے۔ پرچھائوں، نانگھن، ٹونے ٹوٹکے، بوا کون کہے ان کو تو سمجھ نہیں، اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمد علی کی بہو کو سوت نے جونک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی، نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن : جی ہاں۔ اے لو، کیا میں جانتی نہیں؟

بیگم : بوا یہ سوتاپے کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں الگ تھلگ رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلگ رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو۔ اس موئی ٹکے کی کھاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی۔ دعا، تعویذ، گنڈے، کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن : پھر اس کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا؟

بیگم : اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سگا ہے۔ جس دن معلوم ہوگیا، میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن : مگر بیگم! ایک بات کہوں، خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم : یہ خوب کہی، میاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گذری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں، میاں سے تھی۔

امیرن : (قہقہہ لگاکر) نہیں بیگم صاحب۔

بیگم : کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن : بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیئے تھا۔ سسرے کی حرم کو اتنی

جوتیاں ......

بیگم : بوا ! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں ؟ سچ کہوں ، مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی۔ ان کے منھ پر کہتی ہوں : آج کو موئی مٹکھائی کے چلتے ، سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں۔ کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن : نہیں خدا نہ کرے۔ مگر ہاں ، بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بیچاری کو ایسے کوسنے دیئے کہ آخر بیچاری چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منھ نوچ لوں۔

رسوا : ہائیں ہائیں ! یہ غضب !

رو کیے گا ذرا طبیعت کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت ہو

امراؤ : مرزا صاحب ! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا : میرے نزدیک تو کوئی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور لڈن کی ماں بھی بیچاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے کہ اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراؤ : واہ مرزا صاحب آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا : جی ہاں ، میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملہ میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی خاں کی بیوی کا تھا۔

امراؤ : ان بیچاری کا کیا قصور تھا ؟

رسوا : ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے میکے بھجوا دیتا اور

پتہ نہیں تب صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ : لڈن کی ماں پر خوب چیخے، خوب چلائے۔ کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر میں نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خاں صاحب آئے تو وہ پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا : بڈھے کی عقل صحیح تھی؟

امراؤ : صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے، ذرا لڈن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی۔ اسی سے اس کی پرچار لیتے تھے۔ کیوں نہ پرچار لیتے۔ لڈن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا : پھر آپ ہی قائل ہو جیے، یہ عین ذمہ داری تھی۔ اچھا اب ایک بات اور بتا دیجیے۔ لڈن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی، یا گھر گرست؟ اور بوا امیرن کون تھیں؟

امراؤ : لڈن کی ماں موئی دھینی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھی، ان کا مکان سنڈیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا وہ بھی بڑے خاں صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی

رسوا : بوا امیرن سے اور بڑے خاں صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا۔

امراؤ : نہ، خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا محلہ کہتا تھا کہ وہ جوانی میں رانڈ ہو کر میرے یہاں نوکری کو آئی تھی۔ اس دن سے کسی نے اس کو بدراہ نہیں دیکھا۔

رسوا : پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتی ہیں؟

امراؤ : تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں؟

رسوا : بہت بڑا مقدمہ ہے۔

بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) نیک بختیں (۲) خرابیں (۳) بازاریاں۔ اور دوسری قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک، تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پہ آمادہ ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ صرف وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمھیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بے چاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں، ہزارہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں؟ اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں یہ بے چاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانہ میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں۔ مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بروں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا انھیں اس کا کوئی فخر نہ ہوگا؟ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ انتہا کی ذلیل سمجھتی ہیں۔ توبہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی نہیں معاف کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی خوب صورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازاریوں پر جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں فریفتہ ہو کر انھیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لئے ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آجاتا ہے، یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے اس لئے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

امراؤ: یہ تو سب صحیح ہے مگر مرد کیوں ایسے بے وقوف بن جاتے ہیں۔

رسوا: اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جذبات پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ چاہتا

ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاہدان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے کمروں پر پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔

امراؤ: مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

رسوا: ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس مرد کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے عزیز و اقارب، دوست، احباب ملامت کرتے ہیں اس خوف سے اکثر جرات نہیں ہوتی مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخلیہ میں بھی منھ سے بات نہیں نکلتی مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تو بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے، دن دھاڑے سر چوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جاتے ہیں گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا۔ ہاتھ میں ہاتھ لے کے میلے تماشوں میں لئے پھرنا ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ: یہ تو صحیح ہے کہ مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا: خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں، یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اقتدار حاصل نہیں ہے اس لئے وہ

رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آزوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے اس لئے ان کی اولاد سے بہت پچھپے چوری ملتی ہیں اور شہروں میں تو آزادی ہے کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ: مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً میاں ارشاد علی خاں کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا: اس کا یہ سبب ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو اس کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں اور اس لئے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

---

(۲۰)

رسوا : ہاں! وہ آپ کی نوچی کیا ہوئی؟ اے ہے بھلا سا نام ہے۔

امراؤ : آبادی۔

رسوا : آبادی کی صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔

امراؤ : مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا : یاد کو کیا چاہیئے۔ واقع میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراؤ : تو یہ کہیئے آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا : سنو امراؤ جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت۔ نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو (خدانخواستہ) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراؤ : اور اگر کوئی مرد حسین نظر آوے؟

رسوا : اپنا نام امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراؤ : کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا: شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگذاشت نہیں کی گئی ہے۔

امراؤ: سیدھی سی ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتے: ع

شرعاً تو جانتے ہیں عرفاً درست ہے

رسوا: یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہوں اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔

امراؤ: سبحان اللہ!

رسوا: خیر اب اس فضول بات کو رہنے دیجئے، آبادی جان کا حال کہئے۔

امراؤ: مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا۔

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

کہاں کی پاک بازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ صورت شکل نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا: اب کیا ہوئی خدا کے لئے جلدی کہئے۔ مر پچ شہر چلی گئی۔ آخر آفت کیا ہوئی جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ: ہم سے گئی جہان سے گئی۔

رسوا: آخر ہے اب کہاں؟

امراؤ : اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا : یہ کہئے گل جوانی شگفت۔

امراؤ : جی ماشاء اللہ سے خوب، پھولیں پھلیں۔ صورت بگڑگئی۔ رنگت الٹا توا ہوگئی۔ غرض کہ سترکرم ہوگئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا : یہ ہوا کیا تھا؟

امراؤ : اے ہوا کیا تھا، موئی لونڈے گیری، سفلی چھچھوری! میں نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا؟ استاد جی کو نوکر رکھا۔ تعلیم دینا شروع کیا مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی میں نے کمرہ علیحدہ کر دیا تھا شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات گالم گلوج، دھینگا مشتی، جوتم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں، جو آیا وارد۔ میں نے مارا پیٹا، سمجھایا مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ میں نے یہ خیال کیا، بچہ ہے کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمد و رفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوایا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان تو تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا، نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سرِ شام کیا دیکھتی ہوں۔ ڈیوڑھی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب : اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی : ہٹو، ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کاہے کا؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے"۔

آبادی : پھر تمھیں کیا؟

چھٹن : (ایک بوسہ لے کے) ہمیں کیا؟ جان جاتی ہے۔ مرتے ہیں۔

آبادی : موئے چار آنے تو دئے نہیں جاتے، مرتے ہیں۔ میاں مرتے سب کو دیکھا، جنازہ کسی کا بھی نہیں دیکھا۔

چھٹن : چار آنے! جان حاضر ہے۔

آبادی : نگوڑی جان کو میں لے کے کیا کروں گی۔

چھٹن : لو ہماری جان کسی کام ہی کی نہیں!

آبادی : لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چونی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ!

چھٹن : واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی : اچھا تو اب جان چھوڑو، جاؤ۔

چھٹن : اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے جیب میں پڑے ہوئے تھے، نکال لیے۔

چھٹن : تمھیں ہمارے سر کی قسم یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مستی منگائی ہے۔

آبادی : تمھارے سر کی قسم۔ میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن : آخر کیا کرو گی؟ پرسوں چونی لے لینا۔

آبادی : واہ! خاگینہ لیں گے۔

چھٹن : تین پیسے کا خاگینہ؟ اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی : تین پیسے کا خاگینہ کچھ بہت ہوا؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے۔ بیوی لینے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں، پیٹ میں درد ہوگا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنہ کا خاگینہ کھا گئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

میں نے دل میں کہا "کیوں نہ ہو موئی کال کی ماری بلا نوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھا لیں تو بد ہضمی ہو جائے۔"

رسوا: کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ: جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بیچ گئی تھی۔ تین دن کی فاقے سے تھی۔ میں نے روٹی کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا میرے پاس رہ، مگر نہ رہی۔

رسوا: کمبخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ: جی، کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی۔ سال میں دو ایک مرتبہ آجایا کرتی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی۔ خدا جانے مر گئی یا جیتی ہے۔

رسوا: ذات کیا تھی؟

امراؤ: پاسن۔

رسوا: اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں دی۔

امراؤ: میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے موئی کو خوب کھلا پیسے چھٹن کے چوک میں اچھال دیے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا کوئی دو روپے مہینہ کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آ کے رہی تھی ـــــ حسنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کر لیں۔ جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا، پاؤ بھر پوریاں، تیل کا لئے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سیکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز نینون کی فرمائش ہے۔ کسی سے مخملی بوٹے کا چونگا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گر کے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صاف

باندھے ہوئے، کف دار کرتے یا انگرکھے، پاس چست، کوئی دھوتی باندھے ہے کوئی چست گھٹنا ڈاٹے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھمک ٹھمک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ ہرن والی سرا میں ایک بوتل ٹھرے کی اڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے، لڑکھڑاتے، ناچتے گاتے۔ بی حسنا ابھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سرِ راہ گالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جوتم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے ہی میں گر پڑے۔ تین چار میلے تک پہنچے، وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار ہوا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا اور یاروں کو دھتا بتائی، اپنے گھر لے گیا۔ انھیں کے کمرے پر آگئے ٹھہرا اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے۔ کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں اور ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حسنا اور تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا آیا۔ اس نے مجمع خلاف کو برہم کیا۔ سب اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روا دار ہوتی۔ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئی۔ اس کے گھر جا کر بیٹھ رہی۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انھیں کوئی پروا نہ ہوئی۔ مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکا دے۔ بی آبادی کو چولہا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہر طور چند روز یوں گزرے، یہیں ایک بچہ جنیں۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینہ کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کی ڈگری ہوئی۔ تین روپیہ نواب دیتے تھے، ڈیڑھ روپیہ میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگیں۔ اس کی ماں پٹھانی

کٹنی بڑے مشہور رنڈی میں تھی۔ جہاں دو چار قلندریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر اور وسعت ہوئی۔ منّے برائے نام رہ گئے۔ میاں منّے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت، پٹھانی کو جل دے کے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے، دن بھر وہاں چلے جاتے تھے، یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انھوں نے محمد بخش، کلو کنجڑن کے لڑکے، سے راہ و رسم پیدا کی بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے، میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمت گاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے۔ وہ اڑا لے گئے۔ انھوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتی تھیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں اگر آپ فرمائیے تو بلوا دی جائیں۔

رسوا: مجھے تو معاف ہی کیجئے۔

---

(۲۱)

ہاتھ آئی مراد منھ مانگی
دل نے پائی مراد منھ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی کریں۔ سرشام سوار ہوکے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو میں مردانی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں، حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے، انھیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے انھوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائیں گی۔ اسی بہانے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چہ پہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محل دار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی، میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے شکایتیں، غدر کے حالات۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہوگئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں، داہنیں طرف کی صحنچی سے کانپور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پائنچے سنبھالے

ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لوٹیا خاصدان لئے ہے۔ ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیگم : اللہ امراؤ! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کانپور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔

میں : کیا کہوں جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آکے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری نہ مجھے آپ کا پتہ تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم : خیر اب تو ہم تم دونو لکھنؤ میں ہیں۔

میں : لکھنؤ کیسا؟ اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم : اس کی سند نہیں۔ تمھیں تو میرے مکان پر آنا ہوگا۔

میں : سر آنکھوں سے، مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم : چوپٹیوں پر نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔

میں پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب۔ اتنے میں ایک مہری بول اٹھی نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔

میں : آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم : نہیں وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں اور پھر تمھارے واسطے میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انھوں نے تو خود کانپور میں کئی مرتبہ ڈھونڈوایا۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں : اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم : کب آؤگی؟ وعدہ کرو۔

میں : اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم : او ہی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہوگئیں ؟ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں ؟

میں : اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی ؟

بیگم : اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے جائیں۔

میں : مناسب ہے، اتوار کو سہی۔

بیگم : کس وقت آؤ گی ؟

میں : جس وقت کہئے مجھے گھر پر کوئی کام نہیں۔ ہر وقت برابر ہے۔

بیگم : تم کہاں رہتی ہو ؟

میں : چوک میں سید حسن خاں کے پھاٹک کے پاس۔

بیگم : اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی، اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں : بہت اچھا۔

بیگم : اچھا تو خدا حافظ۔

میں : اچھا ہاں، یہ تو کہئے صاحب زادہ کیسا ہے ؟

بیگم : نبن۔ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ لو اب تم نے یاد کیا۔

میں : کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

بیگم : اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا۔

میں : رات کی نیند حرام۔ لے، اب کچھ نہ کہئے۔ خدا حافظ۔

بیگم : خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔

میں : ایسی بات ہے !

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر چلا، کہنے لگی "بیگم صاحب چلئے دیر سے کہار غل مچا رہے ہیں۔ سواری لگی ہے"۔

۲۲

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی مگر جب تک وہ جیتی رہیں اپنا سرپرست سمجھا کی اور سچ یہ ہے کہ انھیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا۔ مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے سے جدا نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دئے اس لئے انھیں نفرت سی اس سے ہو گئی تھی لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرہ لے لیا تھا مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرہ خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا وہیں جا کے رہتی تھی۔ سال بھر کہیں رہوں مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی، جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ

علیل ہے تمھیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انھیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑا نکالتی لیتی چلوں۔ کمرہ کھولا، دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہیں، پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے، فرش فروش الٹا پڑا ہے، ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک دن وہ تھا کہ یہ کمرہ ہر وقت کیسا سجا سجایا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام نہ تھا۔ تنکا تک کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی تھی۔ آدمی ساتھ تھا، میں نے اس سے کہا "ذرا جالے تو لے لے"۔ وہ ایک سینٹھا کہیں سے ڈھونڈھ کے اٹھا لایا، جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں، میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کے دری بچھائی۔ چاندنی کوٹھے پر کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوا دئے۔ کوٹھری میں سے سنگار دان، پان دان، اگال دان اٹھا لائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح گئے زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاص دان تھا پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منھ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدر دانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد علی کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت غرض کہ جو جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے، وہ کمرہ اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی، پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں نظر سے گذر گئیں تو یہ دورہ از سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دورے جلد جلد ہوے۔ اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص

نے متعلق تھے ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے جب دماغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں، اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا، پھر ان کا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعر و سخن کا چرچا، خان صاحب کا مخل صحبت ہونا، بدزبانی کرنا، سلطان کا تمنچہ مارنا، خان صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جاں نثاری، کوتوال کا آنا، خاں صاحب کا گھر بھجوانا، سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا، لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا۔ پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے۔ یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا، طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی : بیوی! دیکھئے وہ کھنکھجورا آپ کے دوپٹہ پر چڑھا جاتا ہے۔

میں : او ہی کہہ کے اٹھی جلدی سے دوپٹہ اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اتار کے جھاڑا۔ کھنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی : (بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں۔ اے لیجئے، یہ کیا ہے؟

میں : (دل میں) اہاہ۔ یہ وہ اشرفیاں ہیں (آدمی سے) اشرفیاں ہیں۔

آدمی : واہ اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں : (ہنس کے) وہ کھنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو ذرا جھجکا پھر پانچوں اشرفیاں مجھے اٹھا کے حوالہ کیں۔

رسوا: تو کیا خانم کا مکان، غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ: لٹا کیوں نہیں، مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایا کسی نے اٹھا کر نہیں دیکھا۔

رسوا: ممکن ہے۔

(۲۳)

کسی طرح سے ہو تسکینِ شوق، کیسا رشک ۔۔۔؟
ملیں گے آج ہم ان سے، رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کہارے کے سر پر سزا دل ہوگئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ بھی نہ پینے پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں سمجھی تھی کھانا دانا کھا کے جانا ہوگا۔ مہری نے کہا بیگم صاحبہ نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا یہیں آکے کھانا۔ میں نے پوچھا "نواب صاحب گھر پر ہیں؟" اس نے کہا "نہیں، صبح سے اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں"۔ میں نے پوچھا "کب تک آئیں گے"۔ مہری نے کہا "اب آئیں تو شام کو آئیں"۔ مجھے بیگم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اس لئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو کے، کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ ہی دسترخوان بچھا ـــــ میں نے اور بیگم صاحبہ نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا ـــــ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چاول کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوہ سوہن۔ کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں:

بیگم: کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں۔

میں: چپ بھی رہو، کوئی سن نہ لے۔

بیگم : سن لے گا تو کیا ہوگا ؟ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔

میں : برائے خدا چپ رہو، کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے ہاتھ منھ دھویا۔ پان کھایا۔ مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہلانے سے ٹال دیا۔

میں : بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم : جب تمھیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا، اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی ہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے ؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا، چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی، کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام آگیا۔ دل نے کہا کہ اوہو ہو، انھیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں : میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں ایک خورشید ہے، اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم : اب میرا حال سنو :

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النساء بیگم صاحبہ کے ہاتھ بکی ہوں، تمھیں یاد ہوگا، میرا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ نواب کو سولھواں برس تھا۔ نواب کے ابا کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نا اتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نا اتفاقی تھی۔ اس بات

سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہئے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں، میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جائداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہی کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور عیش کرتی ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہو۔ میری ظاہر میں تو کسی طرف نگاہ اٹھا کے کبھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوست آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔ کچھ میں ان کے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی۔ خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا بن کو پروان چڑھائے۔ بہو بیاہ کے لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دیئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آرہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر۔ بکی بھی تو کہاں ؟ رنڈی کے گھر میں۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا۔ جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہو چکیں تو نوکروں کو آواز دی۔ طبلہ کی جوڑیاں ،

ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلے تھے تو وہ رام دئی تھیں اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے، پھر وہ بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجا لیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا۔ اس کو گوایا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

---

(۲۴)

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام، محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہو گئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ، سب چیزیں ہٹا دی گئیں۔ چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں اور سب لوگ، اپنے اپنے قرینے سے ہو گئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کے مقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہاں سے دروازہ کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کے کہا "نواب صاحب آتے ہیں"۔ چند لمحہ کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا "بسم اللہ الرحمان الرحیم" نواب اندر داخل ہوئے۔

میں: (صورت دیکھتے ہی، دل میں) وہی! تو ہیں (سلطان صاحب) اہے ہے، کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی، پہلے تو کچھ جھجکے، پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جوان کی طرف، تو حیرت ہے
مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری ہی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ :

بیگم : اری نواب، دیکھتے کیا ہو؟ وہی ہیں امراؤ جان جو کانپور .... (انجان بن کے) ہاں میں نے تم سے انہی کا تذکرہ کیا تھا۔

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں، ایک ذرا سرک کے، بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس عرصہ میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا، میں نے کنکھیوں سے انھیں دیکھ۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں۔ منہ سے بولنے کا موقعہ نہ تھا۔ مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت رمز و کنایہ، سب اشاروں میں ہو گیا۔

نواب : (کسی قدر اجنبیت سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کانپور میں اس شب کو تمھاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں : یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب : خیر جو کچھ ہو وجہ تمھاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا، مگر ایک بڑی خیریت ہو گئی تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں : یہ حضور ان دنوں جنگل میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب : کیا کہوں ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتہ جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں : وہ کوٹھی ایسے جنگلوں میں ہے کہ جو واردات نہ ہو، تعجب ہے۔

نواب : سوائے اس واقعہ کے اور کوئی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر

ہونے کو تھا۔ بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیر مچا تھا۔

اس کے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دستر خوان بچھا۔ سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی تو نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی:

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ ادا یاد آئی — یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گذر ہی جاتی — کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیت عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں مقطع یہ ہے:

کیا غزل کوئی کہے ہے....
آج کیوں بادِ صبا یاد آئی

برسات کے دن ہیں، پانی جھما جھم برس رہا ہے، آموں کی فصل ہے، میرے کمرے میں مجمع ہے ــــــ بسم اللہ جان، امیرن جان، بیگا جان، خورشید جان، رنڈیوں میں۔ نواب بن صاحب، نواب چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں۔ گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں:

بسم اللہ: کیسی ہوگا۔ گانا تو روز ہوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیسا مینہ برس رہا ہے۔

میں: اونہہ، بازار سے جو جی چاہے منگوا لو۔

خورشید: بازار سے منگوا لو، یہ خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں، مزا ہی اور ہے۔

امیر: بہن! تمھیں ھنڈیا ٹھونکنے کا مزا ہے، ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔

بیگا: تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں: اے ہے باجی، کیا بھوکی ہو؟

بیگا: میں تو بھولی نہیں ہوں، بسم اللہ سے پوچھو۔ انھوں نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ: بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیے۔

میں: بتاؤں! چلو بخشی کے تالاب چلیں۔

بسم اللہ: ہاں بھئی، کیا بات کہی ہے۔

خورشید: خوب سیر ہوگی۔

بیگا: ہم بھی چلیں گے۔

میں: اچھا تو سامان کرو۔

بات کرتے میں تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوایا گیا۔ دو چھولداریاں نواب صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا۔

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں کہ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں، مینہ برس رہا ہے، درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے، نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں، مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے میں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولھے بن گئے، کڑاھیاں چڑھ گئیں،

پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب، چھٹن، صاحب برساتی پھن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں پکا لائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھولداری میں بیٹھی رہی۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منھ پر آم کا رس مل دیا۔ پھر ان کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا، دیکھنے کا تماشہ تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹنیاں آنکلیں۔ ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ کا ڈھولکی والا غضب کی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا اگر اس موسم میں اور ایسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے، جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے۔ سورج انہی گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا، جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت، جیسی کہ

میں ہوں، جلدی سے پھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی تھی ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی، نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر جا رہی ہوں۔ تالاب دہنے چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بیہڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور ایک نالہ ملا۔ نالے کے اس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا، کھرپی ہاتھ میں لئے، کچھ کھود رہا ہے۔ میرے اس شخص کے چار آنکھیں ہوئیں۔ پہلے کچھ شبہ سا ہوا۔ پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ دہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کمبخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی۔ اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر دلاور خاں نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی گھگی

بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا یہ حال دیکھ کے کہا "ہائیں ڈر گئیں؟" میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش : وہاں کیا دھرا ہوا ہے۔ ایک کھرپی پڑی ہوئی ہے۔ واہ! اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا ہے اور وہ گیا کہاں جو کھود رہا تھا؟

منہ سے تو بولا نہ گیا، ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش : چلم پینے گیا ہوگا تکیہ پر۔ اچھا تو چلئے نواب چھبن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ کہئے آپ مل گئیں۔ نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں نے ہاں نا کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئے۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے دانے سے فراغت ہوگئی، میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں : تم نے اچھی طرح سے دیکھا؟ یہ وہی دلاور خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کر گرفتار کرتے۔ بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھودتا کیا تھا؟

میں : کیا معلوم۔ موا اپنی قبر کھودتا ہوگا؟

اکبر علی خاں : اس کے نام سے تمھارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمھارا کیا کر سکتا ہے؟

میں : (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہوگا اسے کھودنے آیا ہے۔

اکبر علی خاں : چلو دیکھیں۔

میں : میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں : میں تو جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لیئے جاتا ہوں۔

میں : کہاں جاؤ گے ؟ اب وہاں دھرا ہوگا وہ کھود کے لے بھی گیا ہوگا۔

اکبر علی خاں : میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھبن صاحب کی چھولداری تھی، وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب : خاں صاحب کہاں جائیے گا ؟

اکبر علی خاں : نواب صاحب ! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا ؟

نواب : جی نہیں۔

اکبر علی خاں : میں حاضر ہوں۔

نواب : آئیے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب : (مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو۔

میں : (اپنی سرگذشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں، اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب : اخاہ ! آپ بھی فیض آباد کی رہنے والی ہیں ؟

اکبر علی خاں : مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے، عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔ یہ کہہ کے سلار بخش کو آواز دی۔ قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا۔ تھانے دار کو رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں تھانہ دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا تھا ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈھا۔ تکیہ پر فقیر سے کسی قدر سراغ ملا اور ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے

کی ملی وہ تھانے دار صاحب کے پاس لے آیا۔

تھانہ دار : خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہوگا۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے بھی خوب ہی تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات، کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تالاب پہنچ گیا۔ تلاشی میں ۴۲ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ کو روانہ ہوگیا۔

رسوا : اچھا تو پھر اس کا حشر ہی کیا ہوا؟ اس قصے کو جلدی ختم کیجئے۔

میں : ہوا کیا؟ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہوگئی، واصل جہنم ہوا۔

---

(۲۵)

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصہ لکھا ہوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کرنے کے لئے دیا تھا، مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں۔ بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کی لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں، خدمت گار، سب نیچے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو دیر تک کروٹیں بدلا کی۔ چاہتی تھی سو جاؤں۔ کسی طرح نیند نہ آئی۔ آخر اٹھی، پان لگا کر ماما کو پکارا، حقہ بھروایا۔ پھر پلنگ پر جا لیٹی۔ حقہ پینے لگی۔ جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں۔ بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں۔ ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے مگر وہ سب کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں۔ جی نہ لگا، بند کر کے رکھ دیں۔ آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا۔ خفقان کی شدت تھی۔ سچ مچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان

میں کوئی کہہ رہا ہے "اچھا امراؤ! بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا۔ جلا دیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمام عمر کے واقعات جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں انھیں کون مٹا سکتا ہے"۔

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے، قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے، مگر میں نے اپنے تئیں سنبھالا۔ چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا۔ جی چاہا۔ جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں۔ پھر اکبارگی یوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا۔ پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا، ورق الٹا۔ دو چار سطریں اور پڑھیں۔ اس وقت مجھے اپنی سرگذشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا اور پڑھوں۔ اور قصوں کے پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا۔ کیوں کہ ان کو پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ درحقیقت کوئی اصل نہیں۔ یہی خیال قصے کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کئے ہیں وہ سب مجھ پر گذرے ہیں، اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا۔ اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری تھے جن کا بیان بہت ہی دشوار ہے اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا۔ کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی، کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے۔ غرض کہ عجیب کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا "جا بجا بناتی جانا"۔ اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی۔ اب میں نے وضو کیا، نماز پڑھی، پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کو کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصے میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی، جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو، زیبا ہے اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک۔

کرنا چاہئے۔ مگر اس کے ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھالاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی۔ نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لئے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں، اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی، اور ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی۔ کوئی کام ایسا نہ کرتی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو اور اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں، میں نے پرورش پائی تھی، جو ان کا طریقہ تھا، وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدہ پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے، جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، مگر جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل کا گرجنا، بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا، سورج گرہن یا چاند گرہن، قحط سالی، وبا وغیرہ۔ ایسے امور اکثر خدائی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہو گئیں۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں، دعا، تعویذ، ٹوٹکے ٹٹکے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی، تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لئے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اس زمانہ میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف، جو اور لوگوں کو

کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میں میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی تھی (ہم) کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے ہاتھ آ گیا تھا اور جب کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا یا کسی اور وجہ سے ملال پہنچتا تھا تو جا و بے جا فلک کی شکایتیں کیا کرتی تھی۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

مولوی صاحب، بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانہ سے بہت ہی اچھا تھا۔ اس لئے ان کی طرح میں بھی اس زمانہ کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کمبخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لیے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہاں زندہ، خود مردہ جہاں مردہ۔ سن رسیدہ لوگوں کی دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انہی کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے، اور چونکہ یہ غلط فہمی مدت سے چلی آتی ہے اس لئے اب عموماً سب کو اس کی عادت ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد میں عیش و آرام میں پڑ گئی تھی۔ اس زمانہ میں گا بجا کے مردوں کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں بہ مقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی یا ناکامیابی مجھ کو ہوتی تھی، وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری صورت، بہ نسبت اوروں کے، کچھ اچھی نہ تھی مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم عمروں میں مجھے ایک خاص قسم کا امتیاز حاصل تھا مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی اتنا ہی میرا خودداری کا خیال

دل میں پیدا ہوتا گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بے باکیوں سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں میں منھ دیکھتی رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا کہ ایسا نہ ہو انکار کر دے، تو خفت ہوگی ——— اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تو ان کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ کہاں تک دے سکتا ہے اور ہم کہاں تک اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق کے اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی، اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں۔ اس لئے میری ساتھ والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی میں گرفتار، کوئی خفقانی، کوئی دیوانی سمجھتی تھی مگر میں نے اپنی کی، کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دستبردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب میں ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے آخر رنڈی تھی نا، کفن کا چونگا گیا۔

مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماشبین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے کفن کا چونگا گیا، یا مرتے مرتے کفن لے مری۔ یعنی اپنے دام بچا لئے اور ازراہ فریب تماشبین پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی، لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی

ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ مچ تائب ہوگئی اور اب انتہائی نیکوکار ہوں مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی سے محبت کروں اور اس محبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص، اور اس کے سوا اور جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے، کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا بھی بے سود ہوگا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے۔ اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب، میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے سن چکی ہوں جو بدرجہا مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں حالانکہ ان کے کان تال سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری شاعری کے مداح ہیں جنھوں نے عمر بھر ایک مصرع موزوں، کہنا تو کیسا، پڑھا بھی نہ ہوگا۔ ایک صاحب میری علمیت کے قائل ہیں خود بھی بڑھے لکھے ہیں مگر مجھ کو مولانا با لفضل الشا سمجھتے ہیں معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا مقلد ہیں۔ ایک میرے عاشق زار، میری دولت و کمال سے کوئی واسطہ نہیں، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ آمین۔ مجھے چھینک آئی اور ان کے درد سر ہونے لگا۔ مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھاگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں، بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو، نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے نہ مجھے کوئی

غرض ان سے ہے۔ ایسے لوگوں کو ہیں دل سے چاہتی ہوں اور بے غرضی رفتہ رفتہ ایک غرض ہو گئی ہے کہ نہ مجھے بغیر ان کے چین آتا ہے اور نہ انھیں بغیر میرے۔ مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا ہوتا! مگر یہ تمنا ایسی ہے جیسے کوئی کہے کاش کہ جوانی پھر آتی! اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے خصوصاً عورت کے لئے۔ خصوصاً رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیرنیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں ہیں۔ کون سی ؟ جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں، قیامت برپا کر رکھی تھی، ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دئے، سیکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ اب کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے، اب کوئی کھڑے ہونے کا بھی روادار نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں سے اکثر اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں، کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں۔ جوانی میں ہزاروں روپئے کمائے۔ ذرا مزے دار جوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر بیٹھیں۔ ایک تو وہ خوبصورت کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں رکھتا۔ پہلے تو بیوی ذرا بگڑیں مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا، خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا کے کھایا۔ آخر کھکھ ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا ہے۔ نکال باہر کیا۔ گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوں۔

بعض بے وقوف، رنڈیوں نے کسی کی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ (اس

حماقت ہیں، میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں مگر جب وہ جوان ہوئی، لڑ دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضہ میں کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ماماگیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے بھی جل دیا ہوتا، مگر وہ تو ہو، اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے، نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھدار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ عورت ہی ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں سمجھتی ہیں کہ جاتے ہم ہیں۔ پھر ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدر دان مرد، زوال حسن کے بعد کنارہ کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرض کہ مرد ان سے کنارہ کش اور یہ مردوں سے شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہل میں بھی) اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھڑا اسن کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو کچھ سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے اور نواب صاحب جنھوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملہ میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں، ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجئے گا) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہارِ عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں اظہار تعشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔

اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت غیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں یا کم از کم ایک کو سمجھ ہو۔

واقعی مرد اس بات میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں، اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب کا عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ نقص فطرت کی طرف سے ہے، اس لئے کہ عورتیں ضعیف القویٰ ہیں۔ ان کو بعض وصف ایسے دئے گئے ہیں جس سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ منجملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے، بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے۔ اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے، اکثر ضعیف جانوروں میں بھی یہ حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ درحقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ہے، نہ عورت۔ بلکہ ہر ایک کو ایسا حسن عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو۔ یوں تو مرد عورت جس کا ناک نقشہ اچھا ہوتا ہے سب اسے پسند کرتے ہیں مگر اصل قدردان، مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا، مرد ہے۔ ایک خوبصورت عورت دوسری خوبصورت عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو اور ایک بدصورت مرد بھی خوبصورت عورت کی رائے میں خوبصورت پھول کی طرح دل پسند ہے اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ ان مردوں میں ایک حد تک پایا جاتا ہے جو کسی مال دار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے۔ اس لئے ہر حالت میں اپنے حمایتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ وقت ضرورت اس کو خطرہ سے بچاسکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے زیادہ توقع ہے، اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چوں کہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہئے، اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے، لہٰذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید یہ کوئی کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں کو ہوتا ہے نہ عورتوں کو، تو میں اسے تسلیم کرلوں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ کچھ ضرورت نہیں ہے کہ انھیں اس کا شعور بھی ہو۔

میں نے عمر بھر کے تجربہ کے بعد یہ امور دریافت کئے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد کبھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ اس لئے ان کو اپنے زمانہ زندگی میں بہت سی بک بک، جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔

میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو، بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دور ہو جائیں۔

مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی کو کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے: "اوہ جی! جو تقدیر میں ہوگا ہو کے رہے گا۔" اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں، ہمیں نہ روکو۔ ہمارے کئے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بدکاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے،

جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا، جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہوگا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی، کیوں کہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانۂ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا۔ لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھاٹک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار، نماز صبح کے بعد ٹہلتے ہوئے بادشاہ ادھر آ نکلے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا، آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یونہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا، پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا، فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کر لی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی، میان سے بدقت نکلی۔ پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگا لی۔ خود جو ولایتی باندھے ہوئے تھے، جس کا طلائی قبضہ تھا، مع کمر مرصع اس کو حوالہ کی۔ اسی موقع پر حضور عالم (خطاب، علی نقی خاں وزیر اودھ) آ گئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ: دیکھنا بھئی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی (کمر سے تلوار نکال کر) یہ دیکھو۔

وزیر: قبلۂ عالم۔ سبحان اللہ! مگر حضور سا جوہر شناس اور قدر دان بھی تو ہو۔ جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ: مگر دیکھنا بھئی! میری تلوار بھی کچھ ایسی بدزیب نہیں ہے۔

وزیر: ظل سبحانی کی تلوار اور بدزیب۔

بادشاہ: مگر لباس اس کے مناسب نہیں ہے۔

(اس اثنا میں مصاحب، ملازم، شاہی چوب دار، خاص بردار آ گئے۔ اچھا خاصا مجمع ہو گیا)۔

وزیر : درست، ارشاد ہوا۔

بادشاہ : اچھا ہمارے کپڑے تو اسے پہنا کر دیکھے جائیں۔

اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے، لباس کی کشتیاں ہاتھوں ہاتھ آ گئیں۔ بادشاہ نے ملبوس خاص جو اس وقت پہنے ہوئے تھے، مع مالائے مروارید اور جوڑے، نورتن، مرصع کار اسے عنایت کی۔ آپ اور کپڑے زیب تن کئے۔ (جب وہ کپڑے پہن چکا)

بادشاہ : ہاں اب دیکھو۔

وزیر : واقعی صورت ہی اور ہو گئی۔

(مصاحبین اور حضار بھی تعریفیں کرنے لگے)۔

بادشاہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے۔ اب سواری آ گئی تھی، سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے تھے۔

سپاہی خوشی خوشی گھر آیا۔ جوہری مہاجن، دلال گویا ساتھ ہی لگے ہوئے تھے۔ اسباب ان کا گیا۔ سب پچاس ساٹھ ہزار روپئے کی مالیت تھی۔

سپاہی کا حال سنئے: کہیں نجیبوں کی پلٹن میں تین روپیہ کا اسم تھا۔ رات کو گھر میں کھانے پر بیوی سے تکرار ہوئی۔ آپ خفا ہو کے گھر سے نکل گئے۔ رات بھر خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔ صبح ہوتے موتی محل کے پاس تھک کے بیٹھ گئے، نیند آ گئی۔ صبح کو طالع بیدار نے جگایا تو یہ کرشمہ نظر آیا۔ دم بھر میں محتاج سے غنی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن ہے جب کہ عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ ملک کو اپنی ملک اور خزانے کو اپنا مال سمجھے۔

انگریزی علم داری میں ان فضول خرچیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی بے انصافی سمجھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو بلا وجہ، بلا استحقاق ایک رقم کثیر دے دی جائے۔ ایسی سلطنت جس میں بادشاہ سے لے کر ایک فقیر تک قانون کے پابند ہیں، اگر استحقاق کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ چلے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے۔

نواب چھٹن صاحب کا حال سنئے: (اثنائے سوانح عمری میں ان کا بقیہ ذکر فروگذاشت ہوگیا تھا)۔ درحقیقت آپ دریا ڈوبنے گئے تھے۔ اس ارادے سے غوطا لگایا کہ اب نہ ابھریں گے مگر جان بہت پیاری چیز ہوتی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے، دم گھبرانے لگا۔ جی میں آیا اب کی ابھر کر پھر سانس لے لیں۔ ابھرے۔ پانی کی سطح پر آکر بلا قصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنے کو جی چاہا۔ پھر غوطہ مارا، پھر وہی حال ہوا، اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے نہ بن پڑا۔ آخر اسی کوشش میں بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس وقت مرزا ولی عہد بہادر مرحوم، مع اپنے چند مصاحبوں کے، بجرے پر سوار ہوکر سیر کو نکلے تھے۔ ان کی نظر جو پڑی، سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا جلدی نکالو۔ انھوں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھے تھے گھبرا گئے۔ آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ مرزا ولی عہد نے اپنے سامنے طلب کیا۔ احوال پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ رئیس زادے ہیں۔ کپڑے مرحمت ہوئے۔ ہمراہ کوٹھی میں لئے چلے گئے۔

چھٹن صاحب ایک تو خوش رو جوان، دوسرے ادب قاعدے سے واقف۔ علم مجلس سے آگاہ، کسی قدر خواندہ بھی تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرض کہ ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لایق تھے۔ فوراً مصاحبوں میں اسم ہوگیا۔ بیش قرار مشاہرہ ہوا۔ اخراجات ضروری کے لئے کچھ مد پیشگی میں مل گیا۔ نوکر چاکر، سواری، سب سرکار سے مرحمت ہوا۔ لیجئے پھر کیا تھا۔ پہلے سے زیادہ ٹھاٹھ ہوگئے۔

اب جو چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ پچاس خاص بردار آگے دوڑے چلے جاتے ہیں۔

بسم اللہ نے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ کہیں میاں مخدوم بخش بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے، ان کو اشارے سے بلا لیا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔ اس کے بعد چچا نے بھی میل کر لیا۔ شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ خانم کو بہت عمدہ دوشالہ، رومال دیا مگر اس دن سے نہ کبھی ہمارے مکان پر آئے نہ بسم اللہ سے رسم رکھا۔ خانم اور چال چلی تھیں۔ بن نہ پڑی، الٹی ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ شاہی میں اس قسم کے کرشمے نظر آجاتے تھے۔ بھلا انگریزی حکومت میں یہ کہاں، وہ دن گئے۔ خلیل خاں فاختہ اڑا گئے۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اسے لایق اور نالایق کا خیال ہو گیا۔

شاہی علم داری میں جاہل، ناخواندہ جو الف کے نام لٹھا نہیں جانتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر نوکر تھے۔ میں کہتی ہوں ان سے کام کیوں کر چلتا ہوگا اور تو اور موئے خواجہ سراؤں کے پاس پلٹنیں اور رسالے تھے۔ بھلا انصاف کیجیے، ہنسنے کی بات ہے یا نہیں۔

تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں، میں بہت دن چکر میں رہی۔ آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے تو اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ کافر ہے جس کو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر لوگ تو معاذ اللہ اپنے تمام افعال ناشائستہ کے برے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے۔ یہ بالکل کفر ہے۔

افسوس جن باتوں کو میں اب سمجھی، اگر پہلے ہی سے سمجھ گئی ہوتی تو بہت ہوتا مگر نہ

کوئی سمجھانے والا تھا نہ خود اتنا تجربہ تھا کہ آپ ہی سمجھ لیتی۔ مولوی صاحب نے جو دو حرف پڑھا دئے تھے وہ میرے بہت کام آئے (خدا ان کے درجات عالی کرے)۔ اس زمانہ میں مجھے اس کی قدر نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ علاوہ اس کے، قدردان اس قدر تھے کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ جب وہ دن آئے کہ قدردان ایک ایک کر کے کھسکنے لگے تو ذرا مجھے مہلت ملی۔ تو اس زمانہ میں کتب بینی کا شوق بڑھا، کیوں کہ سوائے اس کے اب کوئی شغل نہ رہا تھا۔

میں سچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جوانی کے ماتم اور اگلے قدردانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانی کی کتابوں سے دل بہلایا کی، ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لئے نکالیں۔ ان میں وہ گلستاں بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ ادھر ادھر سے ورق الٹ پلٹ کے پڑھنے لگی۔ پہلے تو مجھے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہو چکی تھیں، خوب ہی دل لگا کے میں نے سرے سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اتر جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب سے اخلاقِ ناصری کی تعریف سن کے اس کے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انھیں سے ایک نسخہ منگا کے پڑھا۔ واقعی اس کتاب کے مطالب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں۔ اس لئے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا۔ پھر دانش نامہ غیاث منصور، نول کشور کے مطبع میں چھپا، اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ و کبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا، اور جو جو نہ سمجھ میں آیا اسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آ گئی۔ اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی، اردو فارسی، بجائے خود پڑھیں۔ اس

سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی۔ قصائد انوری و خاقانی جستہ جستہ پڑھے، مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا اس لئے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں، انھیں دیکھا کرتی ہوں، ان سے دنیا کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کفایت شعاری کی وجہ سے میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کر لے جاؤں گی۔ وہاں کا اللہ مالک ہے۔ میں بہت دن ہوئے، سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں۔ اور حتی الوسع روزہ نماز کی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں، خدا چاہے مارے چاہے جلائے۔ مجھ سے پردے میں گھٹ کے تو نہ بیٹھا جائے گا۔ مگر پردہ والیوں کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا ان کا راج سہاگ قایم رکھے اور رہتی دنیا تک ان کا پردہ رہے۔

اس موقع پر میں اپنی ہم پیشہ عورت کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں، وہ اپنے دل پر نقش کر لیں۔

اے بے وقوف رنڈی! کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا۔ وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ اس لایق ہے۔ سچی چاہت کا مزہ اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک منھ دیکھ کے دوسرے کا منھ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔

خیر میری تو جیسی گذرنا تھی گذر گئی۔ اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جتنے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے، کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں۔ اب کسی بات کی تمنا نہیں رہی۔ اگرچہ یہ آرزو کمبخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے امید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم

کرتی ہوں اور سب سے امیدوار دعا ہوں۔

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات،
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہوگئی

ختم شد